کچھ یادیں، کچھ باتیں دستخطی)

عارف حجازی

برائے تبصرہ
جناب ایڈیٹر صاحب
ہفت روزہ چٹان
لاہور
عارف حجازی
1/3/60

کچھ یادیں

کچھ افسانے

عارف حجازی

(مطبوعہ)

ادبیات پاکستان

۱۸/ڈی۔ گجرو نالا بلاک ۲ ناظم آباد کراچی

قیمت مجلد دو ۲ روپے آٹھ آنے
مشتاق بک ڈپو
کراچی نمبر ۱

تعارف

افسانہ اور حقیقت کے بین بین ایک صنف ہے جسے "رپورتاژ" کہتے ہیں، بے تکلف، آزاد مگر ساتھ ہی لطیف و دلآویز، اٹھکھیلیاں لیتی ہوئی۔ یہ ایک نئی صنف ہے اس لئے اس کے راز داں اور مزاج داں بھی کم ہیں جو اس کا صحیح معنوں میں حق ادا کر سکیں۔ اس کے لئے ایک خاص ذوق اور سلیقہ درکار ہے جسے حکمت کہتے ہیں۔

عارف حجازی ـــــ جواں سال، جواں روح ـــ اپنی سیلانی و رومانی اور شاید کسی قدر طلسمی شخصیت کے ساتھ جو ذوق نظر اور شوق جہاں پیما کو ساتھ لئے ہوئے ہے اس صنف کے لئے خاص طور پر موزوں واقع ہوئے ہیں کیونکہ وہ مشاہدہ کو افسانہ میں سمونے کا قدرتی سلیقہ رکھتے ہیں۔ اور "وادئ سرما ہو یا سرحد کا مغنی دریا"۔ "چناری اور جہلم کے اس پار" ہو یا "فتح بلاغ کے

ویرانوں میں" ان کا قلم چلتی پھرتی، بولتی چالتی تصویروں اور جاندار چونچال مرقعوں کے ساتھ ہو بہو موقلم معلوم ہوتا ہے۔ کسی چینی مصوّر کا موقلم جو قلموں سے ملتی جلتی سلسلہ در سلسلہ تصویریں تیار کرنے میں ماہر خیال کئے جاتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی تامّل نہیں کہ یہ پُر کشش تحریریں پڑھنے کے لئے بہت خوش آیند مواد مہیا کرتی ہیں اور کیف و تفریح کے نہایت خوشگوار لمحات، ایسے کہ آپ کی ذہنی فضا مدتوں ان سدا بہار پھولوں کی رنگینیوں اور ——— یادوں سے معمور رہے۔

"ماہِ نو" کیلئے جناب حجازی کے نقوش اکثر باعثِ زینت ہوتے رہے ہیں اور مجھے امید ہے کہ اپنی گوناگوں جاذبیتوں کے ساتھ آیندہ بھی ذوقِ دل و نگاہ کا سامان بہم پہنچاتے رہیں گے۔

رفیق خاور

مدیر "ماہِ نو"، کراچی

۳ر دسمبر ۱۹۵۹ء

مادرِ وطن کے نام

ہر دور میں ادب کی ترقی کے لئے دانشوروں اور ادیبوں نے راہیں تلاش کی ہیں اور اسے آگے بڑھانے میں دن اور رات ایک کر دیئے ہیں اس طرح ہمارا ادب بتدریج وقت اور زمانوں کے فاصلے کو طے کرتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ اور ابھی اسے ترقی کی بے انتہا طویل مسافتیں طے کرنا باقی ہیں جس کی ذمہ داری ہمارے دور کے ادیبوں اور دانشوروں پر ہی ہے۔

ہمارے دور کے ایسے ہی صاحبِ ذوق اور صاحبِ علم شخصیتوں میں مستفیض احمد صدیقی صاحب بھی ہیں۔ جہاں اُن کی سماجی خدمات سے کراچی کی کثیر آبادی واقف ہے وہاں ان کی ادبی خدمات بھی کسی طرح کم نہیں یہ کتاب انھیں کی بے لوث خدمات کی مرہونِ منت ہے۔ ہم موصوف کے بے حد ممنون ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے چھاپنے میں بڑی فراخدلی سے ہماری مدد فرمائی اور اپنے ادبی ذوق اور خدمت سے مالا مال کیا۔

ناشر

د

جھلکیاں

پیرایۂ آغاز

(مطبع انٹرنیشنل پریس میکلوڈ روڈ - کراچی -)

ادارۂ ماہ نو۔ کراچی کے شکریہ کے ساتھ

پیرایۂ آغاز

مشرقی اور مغربی پاکستان

"مشرق اور مغرب۔ میرے دل پر ان کی جولانیوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا ..." یہ تو ہوئی ایک مغربی شاعر کی بات۔ لیکن ہم بھی تو اپنے مشرق و مغرب کے متعلق کچھ ایسا ہی محسوس کرتے ہیں شاید اس میں جذبات کو بھی دخل ہو۔ کیونکہ مشرق ہو یا مغرب، شمال ہو یا جنوب، ہمیں اپنی ساری سرزمین ایک ہی نظر آتی ہے۔ ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی، ایک ہی جاودانی کیف کی حامل۔ اور اس میں بسنے والے، ان کے طور طریق بھی ایک ہی جیسے لگتے ہیں۔ ان میں خشکیوں کے دور دراز فاصلے ہوں یا بے پایاں طوفانی سمندروں کے، ان کی وحدت، ان کی یک رنگی ایک نمایاں حقیقت

ہے۔ ادہر کے کوہ ودریا وادیاں، میدان، ہرے بھرے کھیت، سبزہ زار ساحل، سمندر بے اختیار اُدھر کے پہاڑوں، ندی نالوں، وادیوں، میدانوں، لہلہاتے کھیتوں، سبزہ زاروں، ساحلوں اور سمندروں کی یاد دلاتے ہیں۔ اور وہاں کا رہن سہن، رسمیں، ریتیں، طور طریق مزاج، عقائد ہر چیز یہاں کی زندگی میں اپنا ہی عکس پاتی ہے۔

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں، اس کے تہہ میں کتنے ہی طبعی حالات اور کتنے ہی عناصر، کتنے ہی عوامل اور تاریخ و تہذیب کے کتنے ہی دھارے کارفرما ہیں جو آپس میں مل کر ایک ہی دھارا بن جاتے ہیں۔ کیونکہ جو ہمرنگی روح میں ہے وہ لازماً خارجی مظاہر میں بھی رونما ہوتی ہے۔

طبعی حالات کا اس ہم آہنگی میں کچھ کم حصّہ نہیں۔ دونوں ایک وسیع و عریض میدان، اس میں لمبے چوڑے دریا بہتے ہیں اور آخر میں ہم آغوشِ سمندر ہونے سے پہلے چھوٹی چھوٹی شاخوں میں تقسیم ہوکر ڈیلٹا پیدا کرتے ہیں، ایک خاص قسم کی زندگی کو جنم دیتے ہوئے بیرونی حصّوں میں سمندر کی وسیع پہنائی اور اس کا مخصوص رہن سہن۔ بعض حصّوں میں پہاڑ اور وادیاں، ہرسبزو شاداب۔ میدانی علاقوں میں کھیتی باڑی اور کسانوں کا سیدھا سادا چلن۔ ادہر ساحل سے دور دور سفینے ہی سفینے۔ کہیں اکیلے اکیلے کہیں بیڑا بیڑا، چاروں طرف بل کھاتی قوس در قوس چمکتی لہریں۔ اَن گنت جیسے ہلال بن ہلال اور اُن میں چمکتا پانی۔ ستارہ ہی ستارہ۔ اس ستارہ و ہلال

کی مسحور کن فضا میں مچھیرے اپنے جال اور ساز و سامان لئے دنوں رواں رہتے ہیں - اور میلوں دور مچھلی کا شکار کرتے ہیں - ادہر خلیج بنگالہ کی طرف نظر دوڑا یئے کیا وہاں بھی ہو بہو یہی سماں نظر نہیں آتا ؟ بلکہ ندی ندی نالہ نالہ یہی سماں ہے - جہلم پر نظر ڈالیئے - اس کی وادی کے کتنے جیالے مضبوط جفاکش نوجوان ہیں - تیراکی میں ماہر - جن پر پاکستانی بحریہ کو ناز ہے - ایسے ہی مشرقی پاکستان کا بچہ بچہ تیراکی اور کشتی رانی میں ماہر ہے - مہران کے زندۂ جاوید فرزند، شاہ بھٹائی رحؒ نے ملاحوں اور مچھیروں کے کیا کیا گیت نہیں گائے - جن میں عرفان کے ساتھ ساتھ رومان کی جھلکیاں بھی ہیں - ادہر بھٹیالی، معرفتی جاری گان - میں کیا کچھ نہیں - زندگی، غم، مسرت، محنت، مشقت محبت، امید، دکھ، سکھ، عرفان، اگر ادھر پنگھٹ پر پیار محبت کی پینگیں بڑھتی اور رومان کی قدرتی خواہش پروان چڑھتی ہے تو ادھر تال تلیا، جھیل ساگر نوجوان دلوں اور زندگی کی امنگوں کو رومان کے سانچوں میں ڈھلنے کی دل آویز فضا مہیا کرتے ہیں اور اگر کبھی من کی ترنگ میں دل کے ساتھ ساتھ پاؤں بھی رقص کا مدھ متوالا روپ اختیار کر لیں تو کیا تعجب ہے اور وہ بھی تال سر یا گیت اور گتوں کی سنگیت میں - چنانچہ ایک طرف خٹک ناچ، لڈی اور بھنگڑا نظر آتے ہیں تو دوسری طرف رقص و موسیقی کی بے شمار رنگ برنگی صورتیں ہیں بلکہ یہ دونوں تو مشرقی پاکستان کی زندگی اور معاشرہ کا لازمی جزو

اور روح رواں ہیں ۔

مغربی پاکستان میں گرم مرطوب جنگلاتی علاقہ کی بے تحاشا برشگالی کیفیت نہ سہی لیکن جب برکھا کا موسم آتا ہے تو کیا یہ اسی طرح دھواں دھار طوفانی نہیں ہوتا اور وہی ہر چہار طرف ہریاول ہی ہریاول کا سماں نہیں پیدا کر دیتا، اور ویسے ہی گیتوں کو جنم نہیں دیتا؟ ۔ شاعر ہوں یا مغنّی، مرد ہوں یا عورتیں، بوڑھے ہوں یا بچے، سب کے دل میں بے پناہ ولولہ پیدا ہوتا ہے اور زندگی اپنے نت نئے ہنگاموں جوش و خروش اور ترانوں کے ساتھ جاگ اٹھتی ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ مغربی پاکستان ہے یا مشرقی پاکستان ۔

مشرقی اور مغربی پاکستان جغرافیائی اعتبار سے کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں، ان کے ماضی اور حال کو تاریخی روایات کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان میں کتنی ہی باتیں مشترک نظر آئیں گی ۔ قدیم قوموں میں سے جو بھی مغربی پاکستان آئیں ان کی کوئی نہ کوئی شاخ مشرقی پاکستان میں بھی آئی اور ان کے بیشتر رووں سے نہ یہ بچ سکا نہ وہ ۔ اس طرح قدرت دونوں کی نسل وخون میں ہمرنگی کا برابر اہتمام کرتی رہی ۔ خواہ سرحد کے آزاد قبائل ہوں یا چٹگام کے ہرے بھرے جنگلوں سے پٹے ہوئے لُشائی پہاڑوں کی خوشنما وادیوں میں بسنے والے چکما ہوں یا ماگھ ۔ قدیم تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ پاکستان کے ان دونوں پہاڑی حصوں کے آزاد قبائل اور چکما لوگوں کی رگوں میں بھی قدیم منگولی نسل کے لوگوں اور دیگر ایشیائی

قوموں کا خون دوڑ رہا ہے۔ یہی حال پاکستان کے ان دونوں علاقوں میں بسنے والے لوگوں کا ہے۔ خواہ یہ علاقے سبزہ زار ہوں یا ریگزار۔

اسی طرح متحدہ پاکستان کے قدیم تاریخی ادوار اور پرانے شہروں کے آثار کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد جب ہم دور مغرب یعنی ایران، عراق، شام اور مصر کے قدیم آثار کا جائزہ لیتے ہیں تو خیال گزرتا ہے کہ شاید کسی زمانے میں مشرقی پاکستان کی خوبصورت فضاؤں سے لے کر وادیٔ نیل تک ایک ہی تہذیب و تمدن کا دور دورہ ہو۔ زمانۂ ماقبل تاریخ اور قدیم ترین زمانے کے متعلق کچھ کہنا دشوار ہے۔ لیکن سامی قوموں خصوصاً فنیقوں کی بحرپیمائی اور تاریخی زمانے میں ایشیائے کوچک کے سواحل سے لے کر عرب الہند اور چین تک نقل و حرکت کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس شاید بعید از حقیقت نہ ہو کہ ان کے قدم جہاں وادیٔ سندھ میں پہنچے اور انھوں نے وہاں اپنے نسلی اور تہذیبی اثرات چھوڑے وہاں مشرقی پاکستان بھی ان کے نقوشِ قدم سے بیگانہ نہیں رہا۔ برصغیر کے جنوبی حصے میں بالائی علاقے کے دراوڑی یا ان سے ملتی جلتی نسل کی آمد بھی قرینِ قیاس ہے اور پھر آریاؤں، منگولوں، مغلوں، ترکوں کی مسلسل آمد، سکونت اور تسلّط تو تاریخ جدید کا ایک اہم باب ہے جن کی بنا پر وادیٔ مہران کو تہذیبوں کا محل قرار دیا گیا ہے۔ ادھر ایسا ہی عمل قرن ہا قرن، قدیم ترین،

زمانوں سے برابر جاری رہا ہے اور نسلی، تہذیبی، تمدنی یا ہیئت ترکیبی نے ویسی ہی مخلوط شکل اختیار کی ہے جس کا نقشہ دوسرے حصے میں نظر آتا ہے۔

ان دونوں علاقوں کے قدیم تاریخی رشتوں کی کہانی کتنی ہی نامکمل سہی لیکن جب اسلامی تہذیب و تمدن کا آفتاب طلوع ہوا تو اسلامی معاشرے نے باہمی رشتہ کو اور بھی مستحکم کر دیا۔ دونوں خطوں کے ہر ہر حصے کی بنیادی زبان کسی نہ کسی صورت میں کوئی نہ کوئی پرانی دیسی بولی ہی قرار پاتی ہے یا پراکرت۔ اور اس پر حاشیہ آرائی دوسری زبانوں کی ہے۔ پھر اسلامی زبانیں تو ظاہر سے لے کر باطن تک اس طرح سرایت کر گئی ہیں کہ سب زبانوں میں ایک ہی خاندان کے اراکین کی سی مشابہت محسوس ہوتی ہے۔

زندگی اور تہذیب کا رچاؤ بھی کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ چنانچہ زندگی کا مادی پہلو ہو یا روحانی، دونوں کے اوضاع و اطوار تقریباً یکساں ہیں۔ یہ ہم آہنگی موجودہ سیاسی وحدت سے کہیں زیادہ قدیم اور بنیادی ہے اور یہی بات غیر معمولی دوری کے باوجود بالآخر ان کے سیاسی ربطِ باہمی کی محرک اور سبب ثابت ہوئی۔ اور جو عناصر حقیقتاً اجنبی تھے وہ فوراً مسترد ہو گئے۔

پاکستان ایک زراعتی ملک ہے یہاں کے آٹھ کروڑ باشندوں کے معاشرتی رشتے لہلہاتے ہوئے کھیتوں ہی سے وابستہ ہیں۔ یہاں کے

تقریباً نوّے فیصدی عوام انہی کھیتوں کے درمیان سانس لیتے ہیں شہروں سے کوسوں دور وہ اَن گنت گاؤں میں آباد ہیں۔ یہ معصوم، سیدھے سادے پُرامن پاکستانی کسان خواہ وہ مشرقی پاکستان کے رہنے والے ہوں یا مغربی پاکستان کے جس طرح رشتۂ ملّی میں تسبیح کے دانوں کے مانند منسلک ہیں اسی طرح ان کی دیہی زندگی کے صبح و شام اور ماہ و سال لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے درمیان بڑی ہی رومانی فضا میں گزرتے ہیں۔ سدابہار ہریالی سے گھری ہوئی جھونپڑیاں مٹی کے کچے پکے گھر اور زمین سے لے کر آسمان تک ان کی کڑی محنت سے حاصل کی ہوئی ہر دم جھومتی مسکراتی ہوئی فصلوں کا لامتناہی سلسلہ دیکھ کر کتنی مسرت اور طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ تو کسی محنت کش کسان کے سیدھے سادے حقیقی دکھ سکھ سے بھرے گیتوں ہی سے ہو سکتا ہے یہ گیت خوبصورت اور آزاد فضاؤں میں جنم لیتے ہیں اور جہاں یہ فصلوں اور دلکش ماحول کی تصویر پیش کرتے ہیں وہاں کروڑوں غریب کسانوں کی معاشرت اور تمدن کی سچی کہانیاں بھی سناتے ہیں۔ جہاں مشرقی پاکستان کے کسان اپریل کی جھلسا دینے والی دھوپ میں پسینے سے شرابور اپنے کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اُسی طرح وہ کھجوروں ناریلوں کے جھنڈوں، بسواڑیوں، اور کیکروں کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی کے تڑپا دینے والے گیت بھی گاتے ہیں۔ دور دراز پھیلے ہوئے دھان اور پٹ سن کے کھیتوں کے درمیان ان کی مترنم آواز بدمست فضاؤں میں نغمے بکھیرتی ہوئی گونج گونج اٹھتی ہے:۔

میرے سنہرے پاکستان
میرے مشرقی پاکستان
جس کے ہرے بھرے کھیتوں میں
نیلی نیلی پیلی پیلی دھان کی بالیاں لہراتی ہیں
لہراتی ہیں بل کھاتی ہیں

بنوں میں، پیڑوں کے سائے میں
بھائیوں، بہنوں، ماؤں کے پیار
اور الفت سے رسی بسی
جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں
دور دور تک بسی ہوئی۔

جیسے جنت کی مٹی!

ایسے ہی جب مغربی پاکستان کے لاکھوں کسان اپنی گیہوں کی لہلہاتی ہوئی فصلوں کو دیکھ کر، فرط مسرت سے جھوم جھوم کر غیر فانی گیت گاتے ہیں تو جیسے خوبصورت فضاؤں کے درمیان ان کی جی دار، پرسوز اور نہایت دلکش صدائیں دونوں بازوؤں کے رشتۂ باہمی کی استواری کا اعلان کرتی ہوئی سنائی دیتی ہیں:۔

کنکاں دیاں فصلاں پکیّاں نی   پکوان پکاندیاں جٹیاں نی
جٹ پیلی دے وچ گجدا اے

(گندم کی فصلیں پک گئی ہیں۔ جاٹنیاں پکوان پکاتی ہیں۔ کھیتوں میں جاٹ پڑا اگر جتا ہے ....)

اور میری یہ تصنیف پاکستان کے انھیں چند علاقائی مقامات کی سیاحت کی مرہون منت ہے جن کا ہر ہر پہلو اپنے اندر ایک مستقل دعوت نظارہ لئے ہوئے ہے۔

عارف حجازی
یکم ستمبر ۵۹ء

وادیٔ سرما

میرا اسلہٹی ملاقاتی بھکشو میاں میری صورت دیکھ کر بولا۔

"آپ کا پستہ قد سانولی صورت اور گول مٹول سر دیکھ کر میں یہ سمجھا تھا کہ آپ میرے ہی دیس کے رہنے والے ہیں۔"

میں نے ذرا حیرانی سے پوچھا۔ "تمہارا مطلب؟"

اس نے مسکرا کر جواب دیا "میرا مطلب سلہٹ سے تھا۔"

"خوب! یونہی سمجھ لو، مگر یہ کیا کم ہے کہ ہم دونوں ایک ہی خدا اور نبیؐ کو مانتے ہیں۔ زبان کا فرق ہمارے اس رشتہ کو کسی طرح توڑ نہیں سکتا۔ ان معمولی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہئے۔ ایسے خیالات دشمنوں کے پھیلائے ہوتے ہیں"

میرا جواب سنکر بھکشو میاں کھسیانی ہنسی ہنس کر خاموش ہو گیا۔ اس کے

چہرے پر ایک عجیب کیفیت چھا گئی، جیسے اسے میرے جواب سے اپنی غلطی کا بڑا احساس ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے موضوع گفتگو بدل کر پھر باتیں، چھیڑ دیں اور میں اطمینان سے کشتی پر بیٹھا ہوا اس کی دلچسپ باتیں پوری توجہ سے سُن رہا تھا۔ بھکشو میاں بولا۔

"اس وادی کے لوگ بڑے بھولے اور سیدھے ہوتے ہیں۔ قلم چلانے کی بجائے کھیتی باڑی کرتے ہیں، دستکاری اور ہنرمندی کا ان میں بڑا شعور ہے مگر جو لوگ یہاں کے ماحول سے واقف نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ دھرتی کے ان پھیلے ہوئے پانیوں کی سرزمین کا ان کی دنیا سے کوئی رشتہ نہیں یہاں تقریباً سال بھر میں چھ مہینے بارش کا موسم ہوتا ہے۔ جون سے لے کر اکتوبر تک کا زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ ہر وقت بادل چھائے رہتے ہیں۔ آج بھی کالی گھٹا چھا رہی ہے۔ وادیٔ سُرما کی کنواریاں شرمیلی گھٹا دیکھ کر اپنے مَن میں ایک عجیب مسرت محسوس کرتی ہیں۔ ان کے گنّے کے رس جیسے میٹھے گیت بڑے پرکشش ہوتے ہیں۔ ان کی پرسوز آواز بانسری کی سُریلی تانوں سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ سُرما کی بیٹیاں اپنے غم کے بوجھ کو ان گیتوں سے ہلکا کر لیتی ہیں اور اس کے بیٹے بڑے وطن پرست، بڑے محنتی ہوتے ہیں۔"

بھکشو نے کشتی کا چپو چلا کر ایک مسرت آمیز نگاہ سے دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ اس وقت دریا کے مٹیالے پانی میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ عجیب سہانا سماں تھا۔ سطحِ آب پر غل مچاتی ہوئی چڑیاں محوِ پرواز تھیں اور

میرا اوپر ادھیان ان آزاد پنچھیوں کی طرف لگا ہوا تھا۔ کشتی عین منجدھار میں تھی۔ بیٹھے بیٹھے مجھے اپنی سیاحت کا زمانہ یاد آگیا میں نے ہندو پاک کا کونا کونا چھان مارا تھا کہیں میں نے زندگی کے رسیلے گیت سنے تھے تو کہیں جوشیلے نغمے ریگستانی قافلوں کو دیکھا تھا۔ سرحد کے سنگلاخ بے برگ و بار پہاڑوں پر "ٹنگ ٹکور" پشتو گیت بھی سنے تھے۔ بنارس کی صبح، اودھ کی شام کا لطف اٹھایا تھا۔ اور پوربی دیس کی کسان لڑکیوں کی زبانی ساون کے گیت جھولے پر گاتے ہوئے سنے تھے۔

"ایک جھولا ڈالا میں نے امبوا کی ڈال پر۔ امبوا کی ڈال پر

امبوا کی ڈال پر

ننھی ننھی بوندیاں رے، ساون کا میرا جھولنا"

اس وقت بھی میرے کانوں میں ایسی ہی آواز آرہی تھی۔ سرما کی فضائیں بھینی بھینی خوشبو سے بسی ہوئی تھیں اور ہلکی ہلکی پھوار سے میرا چہرہ نم ہو رہا تھا۔ کئی دلفریب مناظر ایسے تھے جنہیں میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ ان میں سے ایک وادی سُرما بھی ہے۔" میں نے نہایت مسرت سے بھرپور نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ کر دل میں کہا۔

کھلی آزاد ہواؤں سے کھیلتے کھیلتے سرما کی بیٹیوں اور بیٹوں کا بچپن گزرتا ہے تو جوانی ان خوشبو سے بسی ہوئی ہواؤں کی مرہون منت ہوتی ہے چاروں طرف لہکتا ہوا سبزہ، پانی ہی پانی اور مست خرام ہوائیں کالے ناگ کی طرح سر اٹھائے ہوئے پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ اور دریائے سُرما

بڑے وقار کے ساتھ اس حسین گوشے میں بہہ رہا تھا۔ اسے وادی کے اس خطے کے سارے گیت یاد تھے، بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے گیت ہی نہیں بلکہ تاریخی اور تہذیبی گیت بھی۔

ہماری چھوٹی سی کشتی ایک ہی رفتار سے بہاؤ کی جانب چلتی رہی، اب میں نے دیکھا تو بھکشو میاں بڑا خوش نظر آرہا تھا۔ اس کی کالی صورت سفید موتی جیسے دانت اور ذرا سی کھچڑی داڑھی۔ سیاہ روشن آنکھوں میں بلا کی جاذبیت اور حسن تھا۔ بنیان پہنے اور تہبند کسے وہ کشتی کھینے میں مصروف تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے مجھے اپنے ساتھیوں کی فہرست میں شامل کر لیا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اس نے بھی میری طرح بہت سے شہر دیکھے تھے۔ شمالی ہند اور یوپی میں بھی رہ چکا تھا چنانچہ جب وہ کوئی بات چھیڑ دیتا تو میں اس کے انداز تکلم اور اشاروں سے بڑا محظوظ ہوتا اس نے مجھے بتایا کہ بنگالی کی طرح سلہٹی زبان میں بھی بڑی قدرت، اور شیرینی ہوتی ہے۔ بنگالی، ہندی پوربی اور آسامی زبان کے ملے جلے الفاظ کی آمیزش نے اس زبان میں ان کی ساری مٹھاس یکجا کر دی ہے خیالات کی سادگی اور رومانی مزاج کی شوخیاں بھی خوب پائی جاتی ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد بھکشو میاں نے بڑی گہری رفاقت کی نظر سے دیکھا تو میں نے پوچھا۔ "ابھی صدر گھاٹ تک پہنچنے میں کتنی دیر لگے گی؟"

یہ سن کر وہ ہنس دیا اور بڑے خوش آیند آواز میں بولا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ پانی دیکھتے دیکھتے اکتا گئے ہیں، مگر یہاں کے لوگوں کی زندگی پانی

ہی میں گزرتی ہے۔ سرما کو ہماری معاشرتی، تمدنی تاریخ ہی نہیں بلکہ اس سرزمین کے سارے اسرار معلوم ہیں۔ اس کی ہر موج ایک نغمہ ہے اور اس نغمہ کی ہر لے کسی "پینا"[لہ] کے بول سے کم نہیں ہوتے۔ آپ زندگی کے سارے گیت اس ساز پر بخوبی سُن سکتے ہیں۔ دیکھئے کیا سندر سماں ہے اس موسم میں تو سرما کی مچھلیاں بھی خوشی سے ناچتی ہیں"۔

ابھی اس نے اتنا کہا ہی تھا کہ ایک بڑی سی مچھلی پانی کی سطح چیر کر تڑپی اور پھر ڈبکی لگا کر غائب ہو گئی۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"یہاں مچھلیاں بھی کثرت سے ہوتی ہیں؟"

"جی ہاں، ایسی مچھلیاں آپ نے دیکھی بھی نہ ہوں گی"

پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے اور کشتی مستانہ چال چلتی رہی۔ میں نے سرما کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ کر دل میں کہا "تو اس وادی کی شہ رگ ہے۔ تیری موجیں زندگی کا بہتا ہوا ساز ہیں۔ جو ہمیشہ بجتا رہے گا۔ تیری ہیرے جیسی مچھلیاں جب اس ساز کے پُر کیف نغموں کو سنتی ہیں، تو ناچنے لگتی ہیں اور ماہی گیروں کے خوب صورت جال تیرے پانیوں پر بکھر جاتے ہیں جب وہ ان کو پانی سے نکالتے ہیں تو وہ ان مچھلیوں کو پا کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے"۔

ابھی میں سرما سے محوِ تکلم تھا کہ سیاہ بدلیوں کا سینہ چیرتی ہوئی

[لہ] ایک ساز جس میں تار کی بجائے گھوڑے کا بال لگا رہتا ہے۔

سورج کی منور کرنیں چاروں طرف پھیل گئیں۔ دور بلند سرسبز چراگاہوں پر قوس و قزح کی رنگینیاں رقصاں تھیں جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی دھان اور پٹ سن کے کھیت جھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ دریا کی پرجوش لہروں کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ہمارے جذبات سے بے نیاز نہ تھی اور دل ہی دل میں کہہ رہی تھی "میں سلہٹ کی تاریخ سے خوب واقف ہوں۔ میں نے تلواروں اور نیزوں کی گھمسان جنگ دیکھی ہے"۔

میں نے جواب دیا۔ تاریخ کی دنیا بہت بڑی ہے۔ اس میں ہزاروں لاکھوں افراد کے افسانے ملتے ہیں قرطاجنہ کا ہنی بال مقدونیہ کا اسکندر، فرانس کا نپولین، دہشت پسند ہٹلر۔ روس کا اسٹالن، غرضیکہ اسی طرح لاکھوں افراد ہیں جو دنیا کے اسٹیج پر ایک نئی تہذیب اور آن بان کے ساتھ اجاگر ہوئے مگر ان میں سے کسی ایک کی زندگی ایسی نہ تھی جو قابل تقلید نمونہ بن سکتی، بلکہ روحانی سکون ملنے کی بجائے ان کی زندگی کے محلوں سے بربادی اور تباہی کی آگ نکل کر ہر جگہ پھیل گئی۔ اب ان روایاتی تاریخوں میں کیا رکھا ہے"؟

پھر مجھے خیال آیا اب تو ہماری عملی تاریخ کا دور پھر شروع ہو گیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب خدا کا قانون بلا تفریق امیر و غریب گورے کالے سب ہی پر یکساں جاری ہو جائے گا۔ وہ قانون جو بادشاہوں کی طرح جسموں پر نہیں بلکہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے۔

سُرما شاید میری باتیں سُن کر مسکرا رہی تھی۔ میں نے اس کے پانی کو

دیکھ کر سوچا شاید اس نے مجھے اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ اس سے پہلے میں اسے منی پور کے شمال میں برئیل[1] کے مقام پر مِل چکا تھا۔ جہاں وہ ایک نوعمر بچی کی طرح اچھلتی کودتی اور آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی بہتی ہے، لیکن سلہٹ پہنچ کر تو وہ صدیوں کی بڑی بوڑھی معلوم ہو رہی تھی، جہاں تک تاریخ کے لہولہان قصے یاد تھے وہاں اُس سرزمین کے محبت، دکھ سکھ اور فصلوں کے گیت بھی یاد تھے۔ وہ سلہٹ سے بارونق شہر کے در و دیوار سے اس قدر مانوس معلوم ہو رہی تھی کہ اس کے دِلی نظارے شہر کی آبادی سے جا ملے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک عرصہ کے بعد اپنے جوان سال بیٹے کو دیکھ کر گلے لگانے کے لئے خوشی سے اپنی دونوں باہیں بڑھا رہی ہے۔

میں نے بیٹھے بیٹھے بھکشو میاں سے دریافت کیا۔ "تمہیں سلہٹ کی تاریخ بھی معلوم ہے؟"

وہ مسکرا دیا۔ پھر سوچ کر بولا۔ "آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"یہی سلہٹ پہلے کیسا تھا۔ یہاں پر کون راج کرتا تھا؟"

"میں پڑھا لکھا تو نہیں ہوں لیکن بڑے بوڑھے کی زبانی سُنتا چلا آیا ہوں کہ آج سے صدیوں پہلے اس وادی کے چپّے چپّے پر دیوی دیوتاؤں کا راج تھا۔ اندھی تہذیب اور گونگے قانون رائج تھے اور چار سُو

---

[1] دریائے سرما کا منبع

جہالت کا دور دورہ تھا۔ سلہٹ کی تاریخ کا یہ زمانہ نہایت بھیانک تھا۔ میں یہاں کی تاریخ کی ایک دلچسپ کہانی سناتا ہوں جو یہاں کے لوگوں کو اب تک یاد ہے، بھکشو میاں لمحہ بھر سانس لے کر بولا۔

"شاید آپ نے کتابوں میں پڑھا ہوگا پہلے سلہٹ کا نام گوبند پور تھا۔ اس شہر کو راجہ گوبند نے بسایا اور یہ اسی کے نام سے مشہور ہوا۔ کہتے ہیں وہ بہت بڑا جادوگر تھا اور اس کی جادوگری کے کمالات کا راز اس کے محل کے ایک کنوئیں میں چھپا ہوا تھا"

"کنوئیں میں!"

"جی ہاں، کنوئیں میں۔ کہتے ہیں اس کنوئیں کے پانی کی صفت یہ تھی کہ جب راجہ کسی مردہ جانور یا آدمی پر اس کو چھڑک دیتا تو وہ زندہ ہو جاتا!"

یہ سن کر میں نے دل میں کہا۔ شاید بھکشو میاں کی یہ کہانی طلسم ہوشربا اور چہار درویش کا قصہ ہے۔ چنانچہ میں چپ ہو گیا اور دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک مسلمان تاجر نے جس کے یہاں اولاد نہیں ہوتی تھی، خدا سے منت مانگی کہ اگر اس کے یہاں بچہ ہوگا تو وہ اپنی عزیز گائے اس کے نام پر قربان کردے گا۔ چنانچہ خدا کا کرنا ایسا ہی ہوا۔ تاجر کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اس نے راجہ کے ڈر کی وجہ سے گائے اپنے گھر میں ذبح کی۔ اسکا سارا گوشت خفیہ طریقے پر اپنے محلے کے چند

مسلمانوں میں تقسیم کر دیا - اور ہڈیاں گھر کے صحن میں دفن کر دیں - سوء اتفاق ایک آدھ ہڈی صحن میں پڑی رہ گئی جسے ایک چیل اٹھا لے گئی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"کہتے ہیں وہ چیل جب اڑتی ہوئی راجہ کے پائیں باغ کے اوپر پہنچی تو ہڈی اس کی چونچ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ جہاں راجہ گوبند چہل قدمی کر رہا تھا۔ راجہ نے ہڈی کو دیکھ کر فوراً اسے پہچان لیا کہ وہ گائے کی ہڈی ہے پھر کیا تھا: اس کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی چاروں طرف جاسوس اس شخص کی تلاش میں لگ گئے جس نے گائے ذبح کی تھی بالآخر بڑی تگ و دو کے بعد وہ لوگ تاجر کو گرفتار کر کے راجہ کے سامنے لے آئے۔ راجہ کے دریافت کرنے پر تاجر نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے سارا قصہ گوش گزار کر دیا۔"

"تو راجہ نے تاجر کو معاف کر دیا۔"

"جی نہیں، اس نے تاجر کے اس جرم کی سخت سزا دی اور اس کے پھول جیسے بچے کو بیدردی سے مروا کے اپنی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا - بیچارہ تاجر روتا پیٹتا اپنے گھر لوٹ آیا اور پھر اسی رات اپنی بیوی کو لے کر دہلی فرار ہو گیا۔ اس کے بھاگ جانے پر راجہ گوبند مسلمانوں کا بڑا دشمن بن گیا۔ اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دیتا رہا۔

کہتے ہیں اس زمانہ میں شہنشاہ اکبر کی حکومت تھی۔ تاجر نے

اکبر کے دربار میں رسائی حاصل کر کے راجہ کے ظلم کی داستان سنائی۔ اس نے راجہ گوبند کی سرکوبی کے لئے ایک بہت بڑی فوج روانہ کی۔ اسی سرما کے دوسرے کنارے پر مسلمان فوج نے خیمے لگائے۔ پھر راجہ کے سپاہی اور مسلمان فوج میں بڑے بڑے معرکے ہوئے لیکن جب مسلمان سپاہی دریا پار اترتے تو فوراً لاپتہ ہو جاتے۔ فوج کا سپہ سالار بڑا حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب مسلمان فوجی دستے دریا کے دوسرے کنارے پہنچتے تو راجہ اپنے جادو کے کنویں کا پانی چھڑک کر انہیں پتھر بنا دیتا۔ آخر مسلمان فوج گوبند پور کا محاصرہ کرنے میں ناکام رہی اور دریا میں کشتیوں اور سپاہیوں کی آمدورفت بند کر دی گئی۔

اسی اثنا میں حضرت شاہ جلالؒ سیاحت کرتے ہوئے اپنے، مریدوں کے ہمراہ نکل آئے وہ سُرما کو پار کر کے آگے جانے کے ارادے سے ٹھہرے ہوئے تھے کہ مسلمان سپہ سالار نے فوج کشتی، سپاہیوں کے لاپتہ ہونے اور راجہ کی جادوگری اور ظلم و ستم کی داستان بیان کی اتنا معلوم ہونا تھا کہ شاہ صاحب کو جلال آگیا اور انہوں نے اپنے عصا کو گھما کر دریا کی سطح پر زور سے پھینکا۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ آناً فاناً پل سا بن گیا۔ آگے آگے شاہ صاحب اور ان کے مرید اور پیچھے پیچھے مسلمان فوج نے نہایت اطمینان سے دریا پار کیا۔ تھوڑی دیر میں چاروں طرف سے ہوا کے طوفان چلنے لگے اور وہ مسلمان سپاہی جو لاپتہ

ہو چکے تھے زندہ ہو کر چاروں طرف سے اُمنڈ آئے۔ راجہ کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ مسلمان فوج فتح و نصرت کا پرچم لہراتی آگے بڑھتی چلی گئی۔"

بھکشو میاں چیخ چلاتے چلاتے رک گیا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"جب راجہ کو اپنی فوج کی شکست کی خبر ملی تو اس نے شہر پناہ کے تمام دروازے بند کروا دئیے اور خود اپنے محل میں چھپ کر بیٹھ رہا۔ شاہ صاحب اور مسلمان فوج جب شہر کے صدر دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ اسے پتھر کی ایک بہت بڑی سِل سے بند کر دیا گیا ہے۔ جسے سینکڑوں ہاتھی بھی گھسیٹتے تو ہل نہیں سکتی تھی۔ لیکن شاہ صاحب کے ایک معمولی نعرے "سل ہٹ" کہنے پر وہ اس طرح راستہ سے ہٹ گئی جیسے ہوا سے تنکا اڑ کے دور جا گرتا ہے پھر کیا تھا مسلمان فوج شاہ صاحب کی رہبری میں شہر میں داخل ہو گئی اور اسی روز سے "گوبند پور" کا نام "سلہٹ" مشہور ہو گیا۔"

"خوب! پھر تو راجہ گرفتار ہو گیا ہو گا۔"

"جی نہیں، وہ بہت دلیر جادوگر تھا۔ اس نے اپنے تمام حربے اور بڑے سے بڑے جادو چلانے میں کسر نہ چھوڑی۔ جس وقت شاہ صاحب محل سرا میں داخل ہوئے تو انہیں سخت پیاس محسوس ہوئی اور پانی طلب کیا لیکن آس پاس کہیں پانی نہ مل سکا۔ چنانچہ وہ اس جادو کے کنوئیں پر پہنچے راجہ بڑا سیانا تھا۔ اس نے کنوئیں میں کئی من — زہر پہلے ہی

ڈلوادیا تھا تاکہ جب کوئی اسکا پانی پیئے تو فوراً ہلاک ہو جائے۔ اس کام کے لئے اس نے اپنے دونوں لڑکوں کو کنویں پر دیکھ بھال کے لئے بٹھا رکھا تھا۔ جب شاہ صاحب نے پانی مانگا تو راجہ کے بڑے لڑکے نے بڑے اہتمام سے ایک خوب صورت برتن میں پانی بھر کے پیش کیا۔ خدا کی شان دیکھیے کہ شاہ صاحب پورا پانی پی گئے مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے برعکس ان کے پانی پیتے ہی راجہ کا لڑکا جو پانی لے کر آیا تھا فوراً کھڑے کھڑے تڑپ کر مر گیا راجہ کو یہ معلوم ہوا تو اس نے جان لیا کہ اب جان بچانے کی کوئی صورت نہیں۔ ادہر شاہ صاحب کی زبانی زہر کا راز سب کو معلوم ہو گیا تھا۔ مسلمان چاہتے تھے کہ راجہ کو فوراً تہہ تیغ کر دیں لیکن شاہ صاحب نے ان کو روک دیا۔ شاہ صاحب کی وجہ سے راجہ کچھ بھی نہ کر سکا

بھکشو میاں کی کہانی سے میں کچھ اکتا سا گیا تھا مگر میں نے مداخلت نہ کی۔ اس نے دہیرے سے کہا کہ "پھر جانتے ہیں آپ کیا ہوا؟ شہر پر مسلمانوں کا قبضہ تو ہو چکا تھا مگر راجہ اپنے محل کے تہہ خانہ میں چھپا رہا اس نے فرار ہونے کی کئی ترکیبیں سوچیں اور اپنی ——— جادوگری کا آخری کمال بھی دکھا دیا۔

"وہ کیا؟"

کہتے ہیں اس نے سانپ کی صورت اختیار کی اور ایک صندوق میں چھپ کر بیٹھ رہا۔ پھر اپنی ماں سے کہا کہ وہ فقیری کے بھیس میں اس

صندوق کو اٹھا کر شہر سے بھاگ چلے، چنانچہ اس کی ماں جب صندوق اٹھائے شہر سے گزر رہی تھی تو شاہ صاحب اپنے مریدوں کے ساتھ آتے دکھائی دیئے راجہ کی ماں گھبرا گئی جب شاہ صاحب قریب آ گئے تو ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ شاہ صاحب صندوق کو دیکھ کر مسکرائے اور ارشاد فرمایا "گوبند! باہر نکل آؤ، تو چھپ کر کہیں بھاگ نہیں سکتا"۔ اتنا کہنا تھا کہ صندوق کا ڈھکنا خود بخود کھل گیا اور راجہ گوبند انسانی صورت میں بکس سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں مسلمان، سپاہی بھی آ گئے اور راجہ کو گرفتار کر کے لے گئے یہ ہے سلہٹ کی تاریخی کہانی، اس کے علاوہ شاہ صاحب کے متعلق اور بہت سے واقعات ہیں جنہیں میں پھر کبھی سناؤں گا"۔

"خوب۔ کہانی تو بڑی دلچسپ ہے"۔ میں نے لمبا سانس لے کر کہا۔

پھر میں نے نگاہ اٹھا کے جنوب کی طرف دیکھا۔ پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ کالی بھینس کی مانند سرسبز جنگلات کے ساتھ بڑی دور تک چلا گیا تھا۔ اسی کوہسار کے دامن میں میلوں میں چائے کے باغات تاحد نگاہ پھیلے ہوئے تھے ان سے تھوڑی دور پر چائے کے کارخانے نظر آ رہے تھے اسوقت ہماری کشتی دریا کے بل کھاتے موڑ پر تھی۔ اور یہاں اس کے دونوں کنارے اور بھی وسیع ہو گئے تھے اور شہر کی آبادی شروع ہو چکی تھی۔ میں نے سُرما کے پانی کو چھو کر دیکھا تو وہ بڑا ٹھنڈا

تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جی بھر کے پی لوں، مگر بھکشو نے کہا "اپنی جگہ بیٹھے رہیئے۔ یہاں پر بھنور پڑتے ہیں"۔ میں سنبھل کر اپنی جگہ جم کے بیٹھ گیا اور سرما کے تیز رفتار دھاروں میں شادابی حسن کے رنگوں کو دیکھتا رہا۔ ہر رنگ میں محبت اور تاریخ کے رومان چھلکتے ہوئے معلوم ہوتے۔ سلہٹی دوشیزاؤں کا حسن ایک امرت ہی تھا۔ ان کے گندمی اور سانولے رنگ میں بڑی نمکینی اور جاذبیت ہوتی ہے پھر چہرے کے خدوخال اتنے پرکشش ہوتے ہیں کہ نگاہ جم کے رہ جاتی ہے بیٹھے بیٹھے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ سرما چپکے چپکے کہہ رہی ہے "رات کے سناٹے میں جب سب لوگ سو جاتے ہیں تو مائیں اپنے بچوں کو حقیقت افروز لوریاں سناتی ہیں۔ ان کے محبت سے بھرپور جذبات میں انوکھی سچائی اور آواز میں بڑا درد ہوتا ہے جسے سنکر ستارے بھی مسکرانے لگتے ہیں اور ننھوں کو نیند آجاتی ہے جب میں ان لوریوں کو سنتی ہوں تو میں بھی اپنی چھوٹی چھوٹی ندیوں کو تھپکا تھپکا کر گانے لگتی ہوں۔

"چندا کاکا — آ دُ آ دُ
بھات دونگی۔ مچھلی دوں گی
کھیٹا کے نیچے۔ بٹھلاؤں گی
آ ننھے کے سر پہ بیٹھ جا"

(آسامی لوری جو ضلع سلہٹ میں بھی رائج ہے)

میں نے کہا کہ "سرما یہ لوری تو دادی کی جیتی جاگتی زندگی کی تصویر

ہے"۔

بھکشو میاں دھیرے دھیرے گنگنا رہا تھا اور کشتی لہروں سے کھیلتی ہوئی چل رہی تھی۔ اب ہم اپنی منزل سے بہت قریب پہنچ چکے تھے

مجھے بیٹھے بیٹھے چائے کے باغ میں کام کرنے والی سلہٹی لڑکیوں کا گیت یاد آ گیا جب وہ تین تین چار چار ٹولیاں بنا کر چائے کی پتیاں توڑنے میں مصروف ہوتی ہیں تو بڑے مزے لے لیکر گاتی ہیں۔

آ ری سہیلی
چائے کی بگیا
دیر نہ کر
دھوپ ہوئی تو رنگ ترا
آنچ سے میلا پڑ جائے گا
صبح سمے ہے کیسا سہانا
چلی بھی آ۔
خوشبوؤں میں بسی ہوئی
اس کی مہک ہر سو پھیلی ہے
دور پہاڑیوں کی جانب سے
آتی ہے جو پر کیف ہوا
کتنی ٹھنڈی روح فزا ہے

اس سے مرا من جھوم رہا ہے
مست ہوائیں مدھ متوالی
لوچ بھرے شریر کو میرے
آن کے جس دم چھو جاتی ہیں
رین نشیلی یاد آتی ہے
آؤ سہیلی
چائے کی یہ ہری ہری
نازک نازک کونپلیں توڑیں
ان کو بٹور کے ہاٹ چلیں
بیچ کے خوش خوش گھر آجائیں
یونہی گزرے آج کا دن
کل کا اپنے خدا مالک ہے
آؤ سہیلی
چائے کی بگیا

اور چائے کے باغوں کی رانی یونہی روزانہ زندگی کے دن کاٹنے کے منصوبے بناتی ہے شب کے خاموش رومان پرور لمحات دن بھر کی محنت و مشقت کو بھلا دیتے ہیں۔ ان گیتوں میں افلاطونی محبت کا افسوں نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ گیت زندگی سے بڑی گہری مناسبت رکھتے ہیں اور انسانوں کی طرح چلتے پھرتے جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ دل کی بات

کے اظہار میں تصنع نام کو نہیں ہوتا۔ جو بات دل میں ہوتی ہے وہی زبان پر۔ عشقیہ گیت ہوں یا فصلوں کے گیت، ان میں ایک ہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ نہ تو غم عشق کی تپش ہوتی ہے نہ ہجر کا رونا۔ حسن فطرت کے شاہکاروں کی جگہ جگہ عکاسی پائی جاتی ہے۔

پھولن کی صورت مسکاتی
اے میری البیلی گوری
میں نے تجھ کو دیکھ لیا
جیسے دھان کی جھومتی بالیں
جنگلی پھول تر و تازہ
تو ہے کتنی کافی پیاری
گاؤں کے آوارہ پرندے
وہ بھی تجھ کو دیکھ کے گوری
خوشی سے پھولے نہیں سماتے

ایسے کتنے گیت سننے میں آئے۔ ہاٹ بازار اور دیہات کے گیت فصلوں کے کاٹنے اور بونے کے گیت، ماہی گیروں اور شادی بیاہ کے گیت جو موسیقیت کی شیرینی سے معمور تھے ان میں زندگی ہی زندگی رقص کناں تھی۔ اگر مغنی اور گشتی گویوں کو اپنے انوکھے ساز "کنتری"[1]

[1] ستار کی طرز کا ساز جس کے سرے پر کدو کا خول چڑھا ہوتا ہے۔

"پینا" اور موہن[1] بانسری" بجاتے ہوئے سنا تو ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی کے غموں کا بند بند ٹوٹ گیا ہے۔ وادیٔ سرما انھیں گیتوں کی پیداوار ہے۔ باجوں میں ایسا جادو ہوتا ہے کہ انسان گزری ہوئی قحط سالی، سیلاب کی تباہی اور دوسرے دکھ سب بھول جاتا ہے۔

یکایک میری نظر شہر کی طرف اٹھ گئی۔ کہیں مغل فن تعمیر کی جھلک نظر آئی تو کہیں قدیم کھنڈرات کے سائے منڈلا رہے تھے۔ جدید عمارتوں میں مزاری چند اسکول، سنسکرت کالج، مدرسہ جذام کی علاج گاہ بھی نظر سے گزری لوگوں کی وضع قطع سے سادگی اور صورت سے مذہبی عقائد نمایاں تھے۔ ڈھیلا ڈھالا کرتہ، پاجامہ یا تہمند سر پہ گول ٹوپی یا ننگا سر، چھتریاں کھولے یا بغل میں دبائے شہر کی مختلف شاہراہیں اور گلی کوچے ان سے بھرے رہتے ہیں۔ ساڑھیاں رنگ برنگی، نیلی پیلی، کہیں سنہری گلگر والی۔ پھولوں کی چھاپ سے آراستہ۔ ایسا لگتا تھا جیسے بے شمار رنگ برنگ مورچل پھر رہے ہوں۔ میں نے دل میں کہا یہاں کے مرد شعر ہیں اور عورت درد اور زندگی کی شیرینیوں سے بھرپور نغمہ! میں سوچتے سوچتے عالم خیال میں کچھ ایسا کھو گیا تھا کہ خبر ہی نہ رہی میں کہاں ہوں بھکشو نے بھنور میں سے نکلنے کے لئے زور زور سے چپو مارے تو میں چونک پڑا جیسے کسی نے جادو کی چھڑی ہلا دی ہو، میری نظروں میں اور ہی سمے گھومنے

---

[1] موہن بانسری کے سُر بڑے جادو بھرے ہوتے ہیں۔

لگے۔ بھکشو نے کہا

"اس دیس میں جادو ہے بابو! آپ ابھی سے اتنے مسحور ہو گئے۔ شہروں اور ان کے باسیوں میں کیا رکھا ہے، ذرا قدرت کی بہار دیکھئے اور یہ بھی کہ اُس نے وادی سُرما کے سینہ میں کیا کیا خزانے چھپا رکھے ہیں۔ نباتات، جمادات معدنیات فصلوں میں چاول، گنّا، آلو، تمباکو، پٹ سن، پھلوں میں نارنگی، بیر، کیلے انناس اور ناریل وغیرہ، چونے کی کانیں، پٹرول کے ذخیرے، سیمنٹ، چائے کی یہ بہتات کہ تین کروڑ روپے کی پیٹی میں ہے۔ حسن فطرت کے یہ مناظر کہ انہیں دیکھ کر انسان اپنی ساری زندگی بھول جاتا ہے۔ چاروں طرف چھوٹی بڑی ندیوں اور تالابوں کا جال ہے۔ بارش سال بھر میں ۱۵۰ انچ جس سے یہ خطہ ہمیشہ شاداب رہتا ہے۔ یہ گوناگوں گھریلو صنعتیں۔ مچھلی کے کانٹے، ماہی گیروں کے جال، بید کی چٹائیاں، فرنیچر، چھڑیاں اور کشتی سازی میں تو اور کوئی شہر سلہٹ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ عطر ایوننگ ان پیرس کی مہک کو بھی ماند کر دیتا ہے۔ کہاں کاریگروں کی انگلیوں کا جادو اور کہاں اندھی مشینیں! شادی بیاہ کی محفلیں، مچھلی کا قورمہ، "ٹری کھانا"[۱] اور "تہاری"[۲] کیسے کیسے لذیذ کھانے ہیں۔ ناچ گانے جادو کا وار پورا کرنے میں آخری چیز ہیں۔

خیالات کی رو میں بہتے بہتے خبر نہیں پھر کہاں کا کہاں نکل گیا۔ چپو کی

۱؎ ایک قسم کا کھانا۔ ۲؎ تہری کو کہتے ہیں۔

لگاتار چھپا چھپ دفعتہً ختم ہوگئی اور کشتی لگلے کنارے سے جا ٹکرائی۔ ایک جھٹکا لگا اور میں جیسے خواب سے اٹھ کر آنکھیں ملنے لگا۔ بھکشو نے کہا، گھاٹ آگیا اور سفر ختم ہوا۔ اب کنارے پر آجائیے۔ میں نے بھکشو میاں کو الوداع کہی۔

فضا میں شام کے سیاہ پردے ڈھلک گئے تھے اور میرے کان ابھی تک سرما کے پرشور لہروں کے نغموں سے گونج رہے تھے۔ چلتے وقت بھکشو میاں کی مخمور آنکھوں میں خلوص و محبت کے طوفان امنڈ آئے تھے اور خدا حافظ کہتے وقت میرا دل اسے دیکھ کر ایک انجانے کرب کے احساس سے خود بھی لرز سا گیا۔ میں نے دل میں کہا "بھکشو! آزاد پانی کے ملاح، میری خوبصورت کشتی کے ناخدا تیری زندگی کتنی زرخیز ہے۔ اب وہ دن دور نہیں ہیں کہ زندگی کی یہ ساری زرخیزیاں وادی سرما کے لوگوں کو خوشحالی کا نغمہ سنائیں گی —— اور اس زمین کا چپہ چپہ سونا اگلنے لگے گا۔

زندہ باد میرے ملاح!

زندہ باد وادئ سرما!

میری طرف سے وادی کے تمام لوگوں کو الوداعی سلام کہدینا۔

سرحد کا مغنّی دریا

لہولہان دنیا کے لہولہان قصّے تو بہت سنے تھے مگر کوہستانی دریاؤں کے نغمے پہلی بار سننے میں آئے "وادیٔ مہمند" میں جب دریائے کابل کی پرشور لہروں کو سنا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی جادو نوا مغنی زندگی کو جگا رہا ہے۔

بیٹھے بیٹھے میں نے خان زماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے دیکھا تو بخار تیز ہو گیا تھا۔ اور نسوار کی دو تین چٹکیاں چڑھانے کے باوجود اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا نہیں ہوتی تھی۔ آنکھیں شرابی کی طرح چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار اونگھنے لگتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے ڈیرے پر پہنچا دیا اور پھر دریا کے کنارے آ بیٹھا۔

دریائے کابل بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا اور اس کی متلاطم لہریں آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ پرندے خوشی کے مارے بچوں کی طرح شور مچا رہے تھے اور جنگلی گلاب کی جھاڑیوں پر بلبلوں نے اپنے سریلے راگ چھیڑ دئے تھے اس خاموش اور رومانی سہ پہر کے لمحات نے مجھ پر ایک جادو سا کر دیا تھا اور میں دریا کے کنارے پر بیٹھا سوچنے لگا —— "یہ دریا ہی زندگی کا سیل رواں ہے۔ لوگوں نے یہاں کی بہادری کے قصے تو سنے ہوں گے۔ مگر یہاں کے شیریں لغمے اور عوامی گیت شاید ہی سنے ہوں۔

یہ سنکر لہریں بڑے والہانہ انداز سے کسی پٹھان محبوبہ کی طرح مسکرانے لگیں اور میری نگاہوں میں اس فرضی محبوبہ کے نازک خدوخال اجاگر ہو گئے۔ اتنے میں قریب کی پگڈنڈی سے ایک نوجوان کی سُریلی آواز آئی "آجکل پھر تیرے حسین چہرے سے سُرخی چھلکنے لگی ہے، جیسے برف میں خون کے قطرے گھل مل گئے ہوں"! یہ سُنکر نہ جانے کیوں مجھے اس محبوبہ پر غصہ آگیا جسے ایک بڑی رقم کے عوض اس کے باپ نے ایک معمر ملک پر بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس بے جوڑ شادی کے خلاف آواز بلند کرے۔ وہ عالم تنہائی میں افسردہ آواز سے گنگناتی رہی۔

"میرے محبوب غیرت کر، میرا ظالم باپ مجھے اژدھے کے سپرد کر رہا ہے"۔

مگر وہ غریب محبوب خود حیران تھا کہ کیا کرے۔ وہ اپنے نصیب سے

جنگ کیا کرتا جبکہ اس کے پاس نہ کھیت تھے نہ کھلیان ۔جب سے اس نے آنکھ کھولی تھی ایک زنی قبیلے کی بھیڑیں چرانا نصیب ہوا تھا۔ فصلوں کی کٹائی کا زمانہ آتا تو کھیتوں میں صبح سے شام ہو جاتی ۔ گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہرا ور جھلسا دینے والی گرم گرم لو اس کے جسم کو جلا دیتی ہے مگر وہ اُف نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کو جھوٹی تسلیاں بھی دینا نہیں چاہتا تھا اس غریب کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

"تلوار کی لڑائی ہوتی تو کرتا ۔ نصیب کی لڑائی ہے ، حیران کھڑا دیکھ رہا ہوں۔"

لہریں مسکراتی ہوئی قریب سے گذر گئیں ۔مجھے ان شریر لہروں پر بڑا رشک آیا۔ اور دل میں خیال آیا کہ وہ زندگی کے غم اور مسرت میں ایک ہی انداز سے مسکراتی رہتی ہیں چاہے قحط کا زمانہ ہو یا لڑائی کا ۔ بہار کا موسم ہو یا خزاں کا انھیں چٹانوں کا مقابلہ کرنا بھی آتا ہے۔ ان کی زندگی سراب نہیں حقیقت ہے۔

میں نے شمال مغرب کی جانب نظر اٹھا کے دیکھا تو کوہ ہندو کش کے مخروطی فلک بوس حصار تا حد نگاہ پھیلے ہوئے تھے اور دور سے یوں دکھائی دیتے جیسے وہ پہاڑ نہیں بلکہ مجبور دوشیزاؤں کے پاکیزہ جذبات کے اہرام کھڑے ہیں جن میں ان کے پیارے پیارے محبوبوں کی یادیں دفن ہیں۔ میرے ذہن کے گنبد میں بے شمار گیت گونجنے لگے ۔

اگر میرے بازو چڑیا کے ہوتے ، تو تیرے حجرے کا طواف کرتی

یترے حجرے کی دہلیز ٹیڑھی ہو جائے، تو لے میرے دل کا کھمبا ٹیڑھا کر دیا ہے۔

لہریں بولیں یہ حجرہ پٹھانوں کی زندگی کا عکس ہے۔ سارے اہم کام اسی میں انجام پاتے ہیں ــــــ شادی، غمی، رقص و سرود، رومان، بڑے بڑے جھگڑوں کے فیصلے ــــــ اس حجرے کی زینت قالین اور حریری پردے نہیں بلکہ چلم ہے۔ دیکھنے میں بڑی معمولی لیکن اس کے بغیر زندگی کی ترنگ باقی نہیں رہتی۔ اس کا سرور محفل پر جادو کر دیتا ہے۔ "یاکہ زار یا قربان" کی لمبی تانیں اور ہی رنگ جما دیتی ہیں۔ ایک طرف اہلِ محفل کی "مرحبا" کا شور اور دوسری طرف۔ سرنا گھڑے پر گھنگرو بندھے ہاتھوں کی تھاپ ان کے صوتی اثرات، اہلِ محفل کے دل کو بے قابو کر دیتے ہیں اور چلم ایک حسینہ کی مانند سامعین اور مغنیوں کے ہاتھوں میں رقص کرتی رہتی ہے۔ اور پھر "چھم چھم چھم" کرتی ہوئی مہ جبیں اپنا درد بھرا گیت چھیڑ دیتی ہے۔

" اے چلم خدا کی قسم میں تجھے توڑ دوں گی، محبوب میرا ہے اور دل تجھ سے بہلاتا ہے۔ اے چلم تو مجھ سے بہتر ہے۔ میرا محبوب دونوں ہاتھوں اور لبوں سے تجھے چومتا ہے۔"

"چھم چھم چھم" کرتی ہوئی کوئی مہ جبیں جیسے ابھی تک میرے ذہن کے حجرے میں ناچ رہی تھی۔ اتنے میں لہریں بڑے رازدارانہ انداز سے بولیں۔

سنا آپ نے محبوبہ کا دیوانہ پن ا"

"وہ کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

دریائی لہریں قہقہہ لگا کر بولیں جیسے آپ نے کچھ سُنا ہی نہیں۔ چلم توڑنے پر تلی ہوئی ہے۔ اس نیک بخت سے کوئی پوچھے اس بے زبان نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ یہی تو حجرے کی بہار ہے۔ کاش محبوبہ بھی اپنے گلابی ہونٹوں سے اس چلم کا بوسہ لے لیا کرے! تب تو محبوب کے شیریں اور لطیف جذبات کی ساری کپکپی اپنے دل میں محسوس کر سکتی ہے اور وہ لذت حاصل کر سکتی ہے جس کے انتظار میں وہ چلم کی سوکن بن گئی ہے۔

اور پھر لہریں اتنا کہہ کر زور زور سے تالیاں بجا کے رقص کرنے لگیں ان کے شور و غل میں مجھے یوں سنائی دیا جیسے وہ محبوبہ مجھے بہت بُرا بھلا کہہ رہی ہے لیکن میں اس کی پوری بات نہیں سُن سکا، صرف اتنا سنائی دیا:۔

"چناب کے پانیوں پر، کچّے گھڑے کے سہارے تیرنے والی بیوقوف سوہنی نہیں، بزدلی سے بہتر ہے کہ مصیبتوں کے پہاڑ جھیل لئے جائیں!"

لہروں پر ایکا ایکی سنّاٹا سا چھا گیا اور جیسے جیسے سورج مغرب کی بھول بھلیوں کی جانب بڑھ رہا تھا ان کی خاموشی زیادہ سنگین ہوتی چلی جا رہی تھی۔ پھر جب تھوڑی دیر میں سورج غروب ہو گیا تو شام کا غبار پھیل گیا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اور نیم وا پلکوں سے مشرق کی جانب دیکھا تو چاند طلوع ہو رہا تھا۔ اس کی منور کرنیں آہستہ آہستہ نمودار

ہو رہی تھیں جیسے سیاہ پہاڑوں کی چوٹیوں سے نور کا دریا پھوٹ رہا ہو۔ اب میں کنارے کی ایک اونچی چٹان پر چڑھ کے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں چودھویں کا چاند سیاہ پہاڑوں کی اوٹ سے یوں نکل آیا جیسے" جلالہ گودر[1] پر پانی بھرنے والی محبوبہ اپنے چہرے سے آنچل ہٹا دیتی ہے اور اس کا ہنس مکھ چہرہ دلکشیوں کا مرکز معلوم ہونے لگتا ہے۔

جلالہ کے پنگھٹ کا خیال آتے ہی جیسے سچ مچ میری نگاہوں کے سامنے کوئی محبوبہ کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اس کا سانس ڈیڑھ میل دشوار گزار چڑھائی پر چڑھتے چڑھتے ابھی تک پھولا ہوا تھا۔۔۔ سنگ ریزوں اور نکیلے پتھروں نے اس کے نازک و مرمریں پاؤں زخمی کر دیئے تھے۔ اس کے باوجود وہ درد و کرب کی شدت کو جیسے بھول گئی تھی۔ ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔۔۔ اور شریر ہوا نے اس کے آنچل کو بھی ہٹا دیا تھا رخساروں پر ننھے سے مصنوعی سبز خال نے اس کے حسن کو اور زیادہ جاذب نظر بنا دیا تھا۔ اور قریب ہی اس کا محبوب ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں کھڑا تصویر حیرت بنا اس کے حسن کی دل آوازیوں میں ایسا کھو گیا تھا کہ جیسے کوئی ستارہ شناس یا سائنسداں چاند کی رومانی اور تخیلی دنیا کے حسین خواب دیکھنے میں مصروف ہے۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے

---

[1] گودر پشتو میں پنگھٹ کو کہتے ہیں۔

ہوا کی تیز لہر کے ساتھ دریا کی منجدھار سے ایک دردناک نغمہ بلند ہو رہا ہو۔

"جلالہ کا پنگھٹ ویران ہو جائے، اس سے محبوبہ کو صدمہ کا عارضہ ہو گیا ہے۔"

اس پر لہروں نے گنگناتے ہوئے کہا۔ "لیجئے اور سُنئے اب میاں ٹڑی کیا فرماتے ہیں۔ اگر جلالہ کا پنگھٹ ویران ہو گیا تو پھر ایسے درد بھرے نغمے کہاں جنم لیں گے اور صدیوں پرانے جلالہ کے پنگھٹ کی تاریخی عظمت کیسے قائم رہے گی۔ مگر میاں مجنوں بھی اس چلم توڑنے والی نادان محبوبہ سے کم نہیں اور جناب کو یہ یاد نہ رہا کہ پنگھٹ کی ہر جڑی بوٹی شفا کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اس نے محبوباؤں کے آنچلوں کو چھوا ہے۔

لہریں آپس میں ٹکراتی ہوئی خاموش ہو گئیں۔ لیکن میں نے انھیں بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"تمہارا خیال اپنی جگہ درست ہو سکتا ہے مگر یہ افلاطونی محبت نہیں بلکہ دل پر جو واردات گزرتی ہے وہ گیت بنکر سارے عوام پر چھا جاتی ہے سچ پوچھئے تو یہی فطری شاعری ہے۔

اس پر لہروں نے کچھ نہ کہا۔ میں نے اپنا چہرہ دریا کے بہاؤ کی جانب پھیر لیا۔ چاندنی رات میں دریائے کابل کا تیز رفتار دھارا پگھلے ہوئے سونے کی مانند بہہ رہا تھا۔ اس صدیوں بوڑھے تجربہ کار مغنی دریا کی زندہ دلی کا ثبوت تو پر جوش لہریں تھیں جو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد شور مچاتی

ہوئی رقص کرنے لگتیں اور کبھی کوئی جادو بھرا نغمہ چھیڑ دیتیں۔

میں چند منٹ ساکت بیٹھا چاند کو اس طرح گھورتا رہا، جیسے کوئی شیر خوار بچہ ماں کی گود میں بیٹھا ہوا اس عجیب وغریب قدرت کی معلق لال ٹین کو دیکھ رہا ہو۔ پھر میں نے آسمان سے نگاہیں پھیرلیں اور وادی کے چھوٹے سے گاؤں کے گھروں کے چھوٹے چھوٹے موکھلوں کی جانب دیکھنے لگا چراغ کی روشنی چنگاری کی مانند دکھائی دی۔ میرا دھیان کسی عورت کی نہایت پرکشش آواز کی طرف بٹ گیا۔ آواز برابر میرے کانوں کے دریچوں سے ٹکرا رہی تھی۔

سو جا میرے پیارے سو جا

تو خالد کا پوتا ہے، تو غزنوی کی نسل سے ہے۔

پھر تیرا دل کیوں جامد ہے۔

تو شہسوار ہے دشمن سے منہ نہ موڑ۔

انگریز کو ملک سے نکال دے۔

اس لوری نے جیسے میرے انگ انگ میں جوش وترنگ کی بجلیاں، کوٹ کوٹ کر بھر دیں، میں سوچنے لگا۔ "میں نے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات یونہی نگر نگر کی خاک چھاننے میں گزار دیئے۔ مگر نہ تو میں خالد بن سکا اور نہ کوئی سائنسداں، پرانی کہانیوں اور عوامی گیتوں کی جستجو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔" مگر پھر خیال آیا۔ دراصل دیکھا جائے تو یہی زندگی ہے اور میرا وجود انہی سچائیوں کا مرہون منت ہے۔ میں انہی حقیقی تاویلات میں کھویا ہوا تھا کہ فضا میں کسی مرد کی پرکشش آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"انسان تمام عمر بھی عبادت کرے تو تیرے احسانوں کا بدلہ نہیں اتار سکتا۔ خدا بڑا غنی ہے، انسان ہو یا مکھی وہ سب کو رزق پہنچاتا ہے"

شب کے پرفسوں ماحول میں جیسے کائنات کا ذرہ ذرہ سربسجود تھا۔ میں نے لمحہ بھر کے بعد جب سر اٹھا کے دیکھا تو دریا کی لہروں سے بھی ایسے ہی نغمے بلند ہو رہے تھے۔ میں نے بڑے خلوص اور احترام سے دریائے کابل سے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

"آزاد قوم کے آزاد دریا تجھ پر میرے دل وجان قربان تو پاکستانی سرحدوں سے بہت دور درّہ اناٸی (افغانستان) سے اپنے ہی بل بوتے پر چل پڑتا ہے۔ پھر تیرے ساتھ بہت سی ندیاں اور نالے آملتے ہیں، تو تیرے حوصلے اور بڑھ جاتے ہیں۔ اور تو بڑی تیزی سے پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں اپنی راہیں تلاش کرتا ہوا وادیٔ پشاور میں داخل ہوتا ہے۔ پشاور سے ۱۹ میل پر مچنی کے میدان میں تیرے کنارے اور زیادہ وسیع ہو جاتے ہیں اور یہیں پر تجھ سے دریائے سوات اور یارا ندی بھی آملتی ہے تو تیری چال اور بھی تیز ہو جاتی ہے جیسے تو زمین کو تمام آلودگیوں سے پاک کرنے کا عزم کر چکا ہے۔ تجھے یہاں کے لاکھوں آدمیوں ہی کا نہیں، سارے پاکستان کے لوگوں کا خلوص حاصل ہے تو اس علاقے کی بنجر زمینوں، سنگلاخ چٹانوں اور میدانوں کو سیراب کرتا ہے۔ تجھے یہاں کی قدیم تاریخ بھی خوب یاد ہے تو نے درّۂ خیبر سے گزرتے وقت نجانے کتنے قافلوں کی پیاس بجھائی ہے۔ میں تیری بزرگی اور تجربوں کی اسی طرح تعظیم

کرتا ہوں جیسے یہاں کے لاکھوں پٹھان ـــــ میرے مغنی دریا! ـــ میں تجھے کبھی نہیں بھولوں گا تو سدا اسی طرح بہتا رہے خدا کرے ـــ اور دیس کے لوگوں کو خوشحالی کے نغمے سُناتا رہے اور ان کی وادیوں کے سیراب کرتا رہے۔

منچھر کے صبح و شام

منچھر جھیل کے گہرے صاف و شفاف پانی کو دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے موہان دوشیزاؤں کی پرکار جوانی پانی کے شیشہ میں اُتر آئی ہے اور حسن و عشق کی ایک وسیع کائنات محبت کے ہمکتے ہوئے لالہ زار دل سے آباد ہے۔ تا حدِ نگاہ آفاقی جلوے بکھرے پڑے ہیں۔ شاداب مرغزار مسکراتے ہوئے کھیت، درختوں کے پراسرار گہرے سائے اور آبی پرندوں کے چہچہے۔ زندگی کے ابدی نغموں کا احساس ہو رہا تھا۔ غرضیکہ مشاطۂ فطرت کے گلکار ہاتھوں نے ریگزار میں جنت کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ لیکن ایک بار پھر میرے تخیل کے افق پر موہان لڑکی کا آفتاب جمال طلوع ہو گیا تھوڑی دیر کے لئے میری نگاہیں حسن و رعنائی کے ایک پیکر حشر انگیز کے گرد طواف کرنے

لگیں۔ پھر منچھر جھیل کے جنوں آفریں مناظر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا میں عشق و محبت کے دورا ہے پر بیٹھا اپنی پچھلی زندگی کا محاسبہ کرنے لگا میں نے دیکھا کہ میری دنیائے محبت تمام پراگندہ تصورات اور خیالات سے پاک ہے اور میرے جذبات، میری خواہشات، میری تمنائیں ان تمام لغزشوں سے دور، بہت دور ہیں جہاں جوانیوں کا خون نچوڑ کر ہوس کے دیوتا کو پلا دیا جاتا ہے۔ یہ سُن کر جھیل میں ایک ہلچل سی پیدا ہوگئی اور اس کی لہریں جیسے گنگنانے لگیں۔

اے مسافر! سُن، زمانے کی چکی میں پس جانے کے بعد بھی تیری زندہ دلی کو نہیں چھپایا جا سکتا۔ تیرے حسین تصوّرات پائمال نہیں ہوسکتے۔ تیری امنگوں اور تیرے شباب نگاہ کو آنچ نہیں آسکتی۔

پھر جھیل کے سینے پر پانی کے چھوٹے چھوٹے گول گول دائرے نمودار ہوئے جو زندگی کے دائروں کی طرح پھیلتے چلے گئے۔ حتّٰی کہ نظروں سے غائب ہوگئے۔ میں سوچنے لگا زندگی کی ان لامحدود وسعتوں پر زندہ دلی ہی کا جادو طاری ہے ورنہ اس کے بغیر یہ حسن اور یہ خوبصورتیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ زندہ دلی ایک مطمئن روح اور عجز و سخاوت کا نام ہے نجانے اس سے کتنے روگوں کا علاج ہو جاتا ہے۔

میں نے سوچا شائد اسی اطمینان، اسی عجز و سخاوت، اسی روحانی سکون نے وادیٔ سندھ کو حسن و جمال سے مالا مال کر دیا ہے۔ ایک زبردست بے آب و گیاہ وادی۔ ایک عظیم ریگستان کو۔ پھر خیال آیا وادیٔ سندھ

کی خوبصورتیاں نجانے کتنے ارمانوں، کتنی تمناؤں اور امنگوں کے گلستاں ہیں جو ہمیشہ ریگزاروں کے بھیانک سینے پر مسکراتے اور کھل کھلاتے رہیں گے۔ وادیٔ سندھ کے خوفناک ریگستان جن میں "مہران" کی رومانی کہانیاں جنم لیتی ہیں، بڑھتی ہیں پروان چڑھتی ہیں اور جن کی بدمست یادیں آج بھی سینوں کے نہاں خانوں میں تازہ ہیں۔ "رومانی داستانوں کی جنم بھومی۔ وادیٔ مہران" کسی نے جیسے چپکے سے کان میں کہا اور کہیں دور اِک تارے کی لطیف دُھن سے فضا معمور ہو گئی۔ نیلگوں آسمان کا گنبد جیسے گونج رہا تھا۔

اس ستار کو میری سانسوں کے قریب لے آ
تاکہ راگ کی ہر تان رگ رگ میں سما جائے۔
میری روح جسم کو چھوڑ کر تیری مدھر آواز کے ساتھ چلی جائے۔
اور ازل کے اسرار تیرے ساز کی جھنکاروں سے تڑپنے لگیں۔

نغمہ ختم ہو گیا۔ اور آفتاب کی آتش فشاں شعاعیں اور تیز ہو گئیں۔ منچھر کا ساکت پانی آئینے کی طرح چمکنے لگا، پھر نیم گرم مست خرام ہوا نے جھیل کی نہروں کو بھی گدگدا گدگدا کے محوِ ترنم کر دیا۔ رنگ برنگے پنچھی خوشی سے چہک رہے تھے۔ جل کوّے، بطخیں، مرغابیاں چپے اور بے شمار پرندے تھے۔ جنھوں نے پو پھٹتے ہی سرگوشیاں شروع کر دی تھیں۔ آفتاب طلوع ہوتے ہی زندگی کی لہریں چاروں طرف دوڑنے لگیں۔ ماہی گیروں کے جال چھپا چھپ کی صدا کے ساتھ یکبارگی

پانی پڑ چھ جاتے اور جس وقت وہ جال کو پانی سے باہر نکالتے تو ہیرے جیسی مچھلیاں دیکھ کر ان کی خوشی کی کوئی حد نہ رہتی۔ انھیں دیکھ کر میں نے دل میں کہا:۔

"منچھر کے گہرے پانیوں میں مچھلیوں کی ایک دنیا آباد ہے اور دنیا کی طرح ان مچھلیوں کی بہت سی قومیں جھیل کی پہنائیوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں انور، شاکر، ردہو کے علاوہ تقریباً دو سو قسم کی اور بھی مچھلیاں جنم لیتی ہیں۔ اور یہ تمام مچھلیاں جھیل کے گرد و نواح میں بسنے والے چالیس ہزار موہان قبیلے کے افراد کا ذریعہ معاش ہیں پھر خیال آیا۔ مچھلی پکڑتے پکڑتے تو دنیا کے اکثر ماہی گیر اور شکاری اپنے تجربوں کی بدولت علم طبقات الارض کے ماہر بن گئے تھے لیکن لیکن ان موہانی ماہی گیروں نے صرف قدرت کی رفاقت ہی حاصل کی۔ جو دیکھا جائے تو قدرت کا بے خطا جادو ہے مگر اس کے باوجود یہ ہزاروں قدیم النسل انسان اپنی ہی کائنات میں گم، دنیا کی نگاہوں اور تاریخ و تمدن کی کتابوں سے اوجھل ہیں۔ موسموں کے تغیر و تبدل، جھیل کی پہنائیوں سے آگاہی رکھنے والے چالیس ہزار موہان منچھر کے آغوش میں ایسے روپوش ہیں کہ دنیا کو ان کی خبر ہی نہیں۔ یہ ہزاروں موہان آریہ قوم سے بہت پہلے اس خوشگوار وادی میں داخل ہوئے تھے اور انھوں نے ہی سب سے پہلے اس خوبصورت جھیل کے کناروں کو آباد کیا۔ ان کی قدامت کا ثبوت

تو اس بات سے مل سکتا ہے کہ وہ آج سے تین سو برس پہلے درختوں کے پتوں سے اپنے جسم کی پردہ پوشی کرتے تھے۔

منچھر ان لوگوں کی زندہ تاریخ ہے اس کی دلفریبیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ موہان اس سے کس قدر متاثر ہوئے، اتنے کہ انھوں نے اس خوبصورت جھیل سے آگے بڑھنے کا ارادہ ہی نہیں کیا اور سیر و سیاحت کے قدرتی جذبات کو اس کی مسکراتی ہوئی ہر دم متلاطم لہروں کے سپرد کر دیا۔ ہزاروں سال گزر چکے مگر کوئی انقلاب انھیں منچھر سے اور منچھر کو ان سے جدا نہ کر سکا۔ اور آج بھی یہ ہزاروں موہان دنیا کے مکر و فریب سے کوسوں دور عکاس فطرت کے دامن میں اپنے ماہ و سال یونہی مچھلیاں پکڑتے، گاتے بجاتے اور ہنسی خوشی بسر کرنے کے عادی ہیں ان میں سے ہر ایک "میر بحر" کہلاتا ہے۔ یہ خطاب "شاہ سمندر" سے کسی طرح کم وزن کا نہیں یہی ان کی عظمت اور قدامت کا ضامن ہے۔ انہی دو لفظوں میں اس قدیم الشل قبیلے کی تاریخ کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ پھر اس کے رہن سہن، اس کے علاقے کا نظم و نسق ہزاروں سال قدیم جمہوری طرز کا ہے جس سے اس کی قدامت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ ہر گاؤں کا ایک مکھیا گویا اس کی چھوٹی سی سلطنت کا صدر ہے۔

میں ابھی انہی خیالات میں محو تھا کہ ماہی گیر نے گنگناتے ہوئے اپنا جال پانی میں بچھا دیا۔ اس کی للچائی ہوئی نگاہوں

ہیں جیسے سینکڑوں رنگین مچھلیاں سمٹ آئی تھیں اس وقت اس کے چہرے پر ایسی ہی کیفیت طاری تھی جیسے کسی فوج کے سالار کے چہرے پر دشمن کے مورچہ پر حملہ کرتے وقت پیدا ہو جاتی ہے اس وقت مجھے محسوس ہوا جیسے دور دراز ماضی بھی زمانہ حال میں تبدیل ہو گیا ہے اور محمد بن قاسم کا حملہ ابھی صدی کا واقعہ ہے یہ سوچکر میں پھر خیالات کی رو میں بہہ گیا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ سہ پہر کا آفتاب سر سے بہت دور تھا شمال کی جانب بادلوں کے سفید ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ نیلگوں آسمان پر سفید سفید بادل، کتنے بھلے معلوم ہو رہے تھے! میں نے اپنے دل سے کہا۔ اوپر یہ براق جیسے سفید بادل، نیچے چاندی جیسی تیس میل کے رقبہ میں پھیلی ہوئی منچھر جھیل جسے قدرتی نہر دل نے دریائے سندھ سے وابستہ کر رکھا ہے، موصل کے آئینہ سے کس طرح کم ہے؟ جب برکھا رُت میں وادی کے مست الست دریا سندھ میں سیلاب آتا ہے تو جھیل بھی سیکڑوں میل کے علاقے پر محیط ہو جاتی ہے اور جب دریا اتر جاتا ہے تو منچھر بھی اپنی اصلی صورت پر لوٹ آتی ہے۔ سارا علاقہ چشم زدن میں سرسبز و شاداب مرغزاروں اور کھیتوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جبھی تو منچھر ایک نہایت شاندار تفریح گاہ کے ساتھ ساتھ نہایت عمدہ شکار گاہ بھی ہے اس کا مقابلہ تو دنیا کی خوبصورت جھیلوں سے

کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صدیوں کی گمنامی نے اسے اب تک فطرت کے دیوانوں اور دنیا کے سیّاحوں کی نگاہ سے محروم رکھا ہے۔ پاکستان کی یہ سب سے بڑی جھیل آج کروڑوں انسانوں کے خواب و خیال سے کوسوں دور ہے۔

منچھر کی رفاقت میں وقت کی خوشگوار گھڑیاں حسین خواب کی مانند گزر گئیں اس عظیم جھیل نے نہ جانے کتنے انقلاب دیکھ رکھے ہیں اور اسے نجانے کتنے حسین سحر و شام سے گزرنا پڑا ہے مگر اسے اس کے باوجود اس کی گوناگوں رعنائیاں، سحر آفرینیاں، اس کی موجوں کا خرام، "دنیکر کے خرامؔ" کو شرماتا ہوا، بدستور قائم و دائم ہے اس کی متوالی فضاؤں میں خزاں کبھی اپنا قدم نہ رکھ سکی اور اس کے حسین ماحول کو کوئی انقلاب آج تک نہ بدل سکا۔ ہزاروں سال بوڑھی جھیل آج بھی کسی حسین دلربا کی طرح اپنی مسکراہٹوں سے ہر نو وارد کا دل لوٹ لیتی ہے۔

پھر میں نے اس عظیم الشان جھیل کے چاروں طرف دیکھا جس کے پُر وقار، خوبصورت کناروں پر غروب آفتاب کی بنفشی کرنیں ناچ رہی تھیں اس حسین شام نے کچھ اور ہی کیفیت پیدا کر دی تھی اور مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میں اسں

لہ "دنیکر کا خرام بھی سکوں ہے" اقبال رحؒ

سے صدہا سال سے مانوس ہوں۔ اتنے میں میرے سر کے اوپر سے مرغابیوں کا ایک غول شور مچاتا ہوا نکلا۔ انھیں یوں محوِ پرواز دیکھ کر کسی کے گنگنانے کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔

"یہ انسان،
یہ مرغابیاں
بہتے پانی یہ سایہ کناں، پر فشاں
جا رہی ہیں کہاں؟
یہ فرازِ زمیں، وسعتِ آسماں
یہ سہانا سماں
کتنا پر کیف ہے یہ سفر!"

میں نے دل میں کہا "زندگی کا یہ پر کیف سفر ہمیشہ یونہی جاری رہے گا۔ جب تک کائنات کی یہ اچھوتی فضائیں زندگی سے وابستہ ہیں۔" پھر میں بھی جھیل کو الوداعی سلام کہہ کر گاؤں کی سمت روانہ ہو گیا۔

چناری کے اُس پار!

جون کی جھلسا دینے والی دھوپ سے بچ کر چرند، پرند، حیوان انسان۔ سب مخلوق چیل کے لمبے لمبے بے ہنگم درختوں کی گھری چھاؤں، خود رو جھاڑیوں اور پہاڑی جنگل میں دبکی پڑی تھی۔ محمد جو ابھی تک نار کے پل کے قریب ایک درخت کے نیچے بیٹھا دریائے جہلم کے موجیں مارتے ہوئے دھارے کو بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔

"محمد جو! یہاں تو جہلم دریا نہیں، ایک چھوٹا سا نالا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی سپولا عمیق اور تنگ دروں کے درمیان تیزی سے بھاگتا چلا جا رہا ہو۔ شہر جہلم میں تو اس کی کچھ اور ہی شان ہے۔"

محمد جُو میری بات سن کر مسکرا دیا اور اپنی متوالی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"قدرت کے نظام میں انسان کو کیا دخل ہو سکتا ہے اگر وہ چاہے تو سمندر کو کوزے میں بند کر دے اور نالے کو سمندر بنا دے۔"

"ٹھیک کہتے ہو محمد جُو" میں نے جواب دیا۔

تمازتِ آفتاب سے ہر شے پر گہرا سکوت طاری تھا اس کے باوجود قدرتی جلوے اپنے شعبدے دکھا رہے تھے۔ چنار ری کے ساکر بنگلے کی پشت پر سر بفلک پہاڑ کی مخروطی چوٹیاں سبزہ زار سے ڈھکی ہوئی تھیں اور اکثر آزاد پرندوں کی ٹولیاں چہکتی ہوئی ہمارے سروں پر سے گزر جاتیں۔ سامنے جہلم دریا اور اس کے ناہموار کنارے سے لپٹی ہوئی شاہراہ جہلم ویلی روڈ نجانے تھوڑی دور جا کر پہاڑوں کی سلوٹوں میں کہاں کھو گئی تھی۔ دریا کے دوسرے کنارے سے آگے جہاں تک نگاہ کام کر رہی تھی۔ دھواں دھار پہاڑوں کے لامتناہی سلسلے ہی نظر آ رہے تھے جیسے دنیا کے سارے پہاڑوں کی حدیں یہیں آ کر ختم ہو گئی تھیں۔ میں نے بیٹھے بیٹھے پھر باتیں چھیڑ دیں میں نے محمد جُو سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "ان پُراسرار پہاڑوں میں کونسی ایسی دلفریبی ہے جس میں تم کھوئے ہوتے ہو؟ کوئی قصہ ہی سناؤ تاکہ وقت کٹے۔"

"قصے کہانیوں میں کیا رکھا ہے نگاہوں کے سامنے جیتی جاگتی

دنیا کی خوبصورتیاں ایسی ہیں کہ ان کے سامنے افسانے اور قصّے ہیچ ہیں یہ پہاڑ، یہ دریا، یہ سبزہ زار، یہ گلبار زمین اور وادیاں خود ایک حقیقت افروز افسانے سے کم نہیں۔ جب میں قدرت کے ان مظاہر کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنا دیس یاد آجاتا ہے۔"

"تو پھر صبر سے کام لو۔ تاریخ تو ہمیشہ ایسے واقعات دہراتی چلی آرہی ہے۔"

محمد جو میرا جواب سُن کر خاموش ہو رہا۔ مگر اس کے گورے چٹے یونانی چہرے پر فکر و سنجیدگی کے گہرے آثار چھا گئے۔ جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔ آخر لمحہ بھر کے بعد وہ خود ہی بول اٹھا۔ "دریا کے دوسری طرف، چناروں کے اس پار قدرت کی حسین جمیل وادیاں ہیں جہاں انسان ایک خوفناک چکّی میں پیسے جا رہے ہیں۔ جب تک میرا وطن آزاد نہ ہو جائے گا میرے دل کو قرار نہیں آسکتا۔ کشمیر کا اڑسٹھ ہزار مربع میل طویل و عریض علاقہ بہشت سے کم نہیں۔ جہاں گوشے گوشے میں ہماری تہذیب و تمدّن، معاشرت اور ثقافت کے بے شمار خزانے ہیں جہاں بزرگوں اور دانشوروں کی یادگاریں آج ویران پڑیں ہیں اور وہاں کا ذرّہ ذرّہ پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ جب تک تم سر سے کفن باندھ کر نہیں اٹھو گے یہ حسین دنیا تمہاری نہیں ہو سکتی۔"

یہ سن کر میں نے محمد جو سے کہا "وقت کبھی یکساں نہیں رہتا قدرت خود ہی سب کچھ کر لیتی ہے اور ایسے ذرائع پیدا ہو جاتے ہیں کہ

قہرمانی دیوتا خود میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ میرے دوست سچائی کو دنیا کی نگاہوں سے لاکھ چھپایا جائے وہ چھپ نہیں سکتی۔"

"مگر جد وجہد کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔"

پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

دریا کی پُر جوش اور متلاطم موجوں کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے انھیں بھی محمد جُو سے بیحد ہمدردی ہے اور وہ پکار پکار کہہ رہی ہیں "ہمیں تمہارے اجداد کی تاریخ خوب یاد ہے۔ ساتویں صدی عیسوی سے بہت پہلے وادیٔ کشمیر پہ بت پرستی کا دور دورہ تھا۔ لیکن تقریباً چھ سو صدی پہلے کی بات ہے کہ یہاں اسلام کا آفتاب نمودار ہوا۔"

میں نے یہ سن کر دل میں کہا۔ "جب تک جہلم اسی طرح بہتا رہے گا یہ ماضی اور حال کی تاریخ دہراتا رہے گا۔" یہ سوچکر میں نے محمد جُو کا شانہ ہلا کر کہا۔ "تمہیں وادیٔ کشمیر کی تاریخ بھی یاد ہے؟"

وہ مسکرا دیا، پھر لمحہ بھر سوچ کر بولا "کشمیر کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ ۷۲۵ھ حضرت بلال شاہ جو بڑے عالم و عامل تھے۔ سرینگر آئے اس زمانے میں تبت کے راجہ کا بیٹا۔ رِنچن جیو، جو بدھ مت کا پیرو تھا، حکمراں تھا۔ راجہ کو جب شاہ صاحب کی آمد کی خبر ملی تو انہیں اپنے دربار میں مذہبی مناظرہ کے لئے بلا بھیجا۔ بڑے بڑے پنڈت اور رشی ایک طرف اور حضرت بلال شاہ کی تنہا ذات دوسری طرف۔ خدا کی شان! شاہ صاحب نے اپنے علم ل کا ایسا مظاہرہ کیا کہ راجہ

کے تمام بڑے بڑے مذہبی پیشوا لاجواب ہو گئے۔ اس پر رتن جیو بڑا متاثر ہوا۔ شاہ صاحب کے ہاتھ مشرف بہ اسلام ہوا اور اپنا نام صدرالدین رکھا۔ اس کے ساتھ سینکڑوں پنڈت، درباری، اور رعایا بھی مسلمان ہو گئی۔ صدرالدین لاولد مرا چنانچہ شاہ میر نامی ایک شخص نے، جس کا بڑا اثر رسوخ تھا، عنان حکومت سنبھالی اور اپنا لقب شمس الدین رکھا۔ ۱۳۰۰ء سے لیکر ۱۵۵۴ء تک اسی شخص کا خاندان کشمیر پر حکمراں رہا ہے۔ اس خاندان کے بڑے مشہور سلاطین شہاب الدین قطب الدین، سلطان سکندر بت شکن اور زین العابدین (المعروف بہ بڈشاہ یا بڑا شاہ) بڑے جلیل القدر اور اولوالعزم حکمراں گزرے ہیں جن کی بدولت شمعِ اسلام کی منور شعاعیں ساری وادی میں جگمگانے لگیں۔

زین العابدین نے علم، ہنر، تعمیر سب ہی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مسجدیں بنوائیں اور ہنود کے لئے مندر بھی اس کے عہد حکومت میں کشمیر نے بڑی ترقی کی۔ صدیاں گزر چکی ہیں۔ لیکن آج بھی ہر فرقہ اور مذہب کے لوگ "بڑاشاہ" کے نام کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ افسوس! اس خاندان کا آخری حکمراں، حبیب شاہ نااہل ثابت ہوا۔ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر خاندان چک کے سردار غازی خاں نے حکومت کی باگ ڈور پکڑی۔ لیکن اس خاندان کے چوتھے حکمراں کے عہد میں بدنظمی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ آپس کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاکر خاندان مغل شہنشاہ اکبر نے کشمیر پر چڑھائی کی اور وہاں اپنا حاکم مقرر کیا۔

ہری پربت پر قلعہ بنوایا اور نسیم باغ لگوایا۔

عہد جہانگیری میں تو کشمیر نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی بیشمار باغات، عمارتیں، مسجدیں اور پر فضا مقامات پر حوض اور حمام بنائے گئے۔ یہاں تک جہانگیر کو کشمیر سے ایسا عشق ہو گیا کہ اس نے دارالسلطنت آگرہ سے لاہور منتقل کر لیا تھا، تاکہ کشمیر سے قربت حاصل رہے موسم گرما میں ملکہ نور جہاں اور جہانگیر یہیں رہا کرتے تھے۔ جہانگیر کے ساتھ اور اس کے بعد شاہجہاں بھی کئی دفعہ کشمیر آیا اور اس نے بھی کئی خوبصورت عمارتیں بنوائیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کو کشمیر آنے کا ایک یا دو ہی دفعہ اتفاق ہوا ہے۔ اسے دکن کی مہم سے اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ کشمیر کے نظم و نسق پر کڑی نظر رکھ سکتا، چنانچہ موقعہ پاکر احمد شاہ درانی نے وادی کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اس طرح وادیٔ کشمیر پر مسلمانوں کی پانچسو برس حکومت رہی۔ مسلمانوں کے زوال کے بعد سکھوں نے ۲۷ برس دور حکومت میں کشمیر کی ترقی کی رفتار سست پڑ گئی۔

جب انگریزوں نے سکھوں کو شکست دیکر کشمیر پر قبضہ کیا تو اس وقت وہاں کی حالت بُری تھی۔ خود انہیں مالی مشکلات ایسی درپیش تھیں کہ انھوں نے کشمیر کو ایک رئیس زادے گلاب سنگھ نامی ڈوگرے کے ہاتھ پچھتّر لاکھ روپئے میں فروخت کر دیا اور اسے مہاراجہ کا خطاب دیا۔ اس وقت سے لیکر تقسیم برصغیر تک کشمیر ڈوگروں کے پنجے میں جکڑا رہا۔ . . . اور اس کے بعد کی تاریخ ہمارے سامنے

ہے . . . . .» محمد جُو نے نیم وا آنکھوں سے دریا کی دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور خاموش ہو گیا۔

میں نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ «تاریخ کا یہ دور بھی جلد ہی گزر جائے گا۔»

محمد جُو نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے پھر وادی کے بارے میں ذکر چھیڑ دیا۔ اس نے دریا کی دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ «کشمیر ہمارے تمدنی ارتقار کا گہوارہ ہے اور اس کے باشندے ہی اس کے سچّے وارث ہیں۔ کشمیر میں صناع حقیقی نے مرغزاروں اور کہساروں کو اس ترکیب سے پیدا کیا ہے کہ ان کی دل فریبی کی تعریف ناممکن ہے۔ اس کی عکاسی تو بڑے بڑے مصوّر بھی نہ کر سکے۔ اگر کچھ دلی تاثرات کی تصویر ملتی ہے تو وہ ہے عاشقِ کشمیر، شہنشاہ جہانگیر کی صدائے دل نواز میں ؎

ازشاہ جہانگیر دم نزع چو پرسید
باحسرت دل گفت کہ کشمیر دگر ہیچ

ذرا چناری کے اس پار کا منظر دیکھئے —— یہاں سے اٹھارہ میل پہ اوڑی ایک نہائت پُر فضا مقام ہے جس کے ایک طرف یہی جہلم سائیں سائیں کرتا بہہ رہا ہے تو دوسری جانب شاداب سبزہ زار نظر آتے ہیں۔ تھوڑی ہی دور باب الکشمیر ہے۔ ہاں —— ہاں بارہ مولا کو باب الکشمیر ہی کہنا درست ہوگا۔ یہاں سے سڑک سیدھی سپاٹ میدانوں

اور کھیتوں کے درمیان سے گزرتی ہے جس کے دونوں کناروں پر سایہ دار درختوں کی قطاریں کھڑی ہیں۔ سڑک کے آگے پیچھے نظر دوڑانے سے ایسا لگتا ہے جیسے کسی مہ پارہ کی سیاہ چمکیلی زلفوں کے بیچوں بیچ سیدھی مانگ نکلی ہوئی ہے۔ دریا، سڑک سے کافی دور ہونے کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے لیکن میدان پاکر اس کا پاٹ بہت وسیع ہو گیا ہے لوگ بارہ مولا سے لیکر سرینگر اسلام آباد اور گاندربل کا سفر کرتے ہیں سیاح عموماً شہر میں ٹھہرنے کی بجائے نہایت خوبصورت متحرک چوبی مکانوں (HOUSE BOATS) میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان اعلیٰ درجے کے چوبی مکانوں میں آرائش و آسائش کے تقریباً تمام سامان مہیا ہوتے ہیں

سری نگر صدیوں پرانا شہر جو ابھی کشمیر ہوتے ہوئے بھی کشمیر نہیں ہے۔ یہاں تخت سلیمان نامی پہاڑ ہے جو شہر کے وسط میں ہے، دیکھنے کے لائق ہے۔ اس کے نیچے دریائے جہلم سانپ کی مانند لہریا بناتا ہوا بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔

اچھابل سری نگر کے بالکل قریب ہے یہ مقام بڑا قدیم ہے۔ انگریز جرنیل جارج مارشل نے یہاں پر قدیم زمانے کے آثار دریافت کئے تھے۔ جن میں چند خستہ عمارتیں نکلیں اور پرانی چیزیں دستیاب ہوئی تھیں جو سری نگر کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی ہیں۔ اچھابل جاتے ہوئے راستے میں دشنو ندی، سندھ اور جہلم دریا کے ملاپ

سے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور پر اسلام آباد آتا ہے۔ جہاں ایک خوبصورت باغ ہے اور چھے حوض جن میں پندرہ فوارے لگے ہوئے ہیں۔ پہاڑ سے پانی گر کر حوض میں گرتا ہے اور پانی کی چادر، مرمریں ڈھلان سے گرتی ہوئی چھٹے آخری حوض میں پہنچتی ہے۔ ایک حوض کے درمیان ایک عمارت بھی ہے جس کے چاروں طرف کمان دار دالان ہیں جو کافی پرانی معلوم ہوتی ہیں۔

یہاں علی الصبح چوبی مکانوں سے دریائے جہلم کا نظارہ بڑا روح افزا ہوتا ہے۔ آفتاب افق مشرق سے طلوع ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے دریا کی رو پہلی سطح آب سے کوئی بڑا سا سنہرا گیند ابھر رہا ہے اس کی منور بنفشی کرنیں پانی کی سطح پر پھلجھڑی کی مانند دمکتی ہیں۔ دریا کے کنارے باغ ہی باغ ہیں۔ نشی باغ جو عہدِ جہانگیر کا اعلیٰ نمونہ تھا آج بھی اس کے والہانہ عشق کے افسانے سنا رہا ہے۔ یہاں چنار کے گھنے درختوں کے کُنج کچھ اور ہی نظارہ پیش کرتے ہیں۔ یہ درخت بڑے مدوّر اور گھنے ہوتے ہیں۔ انگور کی بیل جیسے پتے، برگد جیسی جسامت اور ڈیل ڈول، جن کی گہری چھاؤں میں ابدی سکون و مسرت کا گمان ہوتا ہے۔ جون، جولائی، اگست اور ستمبر میں ان کے سبز پتوں کو دیکھ کر یہ خیال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنا رنگ بدل سکتے ہوں لیکن جہاں اکتوبر شروع ہوا، ان کی رنگت زرد ہونے لگتی ہے اور نومبر میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چنار کے درختوں میں آگ کے شعلے

بھڑک اٹھے ہیں۔ اور سارے باغ میں آگ ہی آگ روشن ہے وہی پتّے جو انتہائی سبز ہوتے ہیں نومبر میں خون کی مانند سرخ ہو جاتے ہیں۔ پھر برفباری کا زمانہ آتا ہے تو یہ پتّے بھی باقی نہیں رہتے بلکہ یہ بلند و بالا درخت برف کے گالوں میں اس طرح چھپ جاتے ہیں جیسے برف کے نیچے دبے ہوئے عہد رفتہ کے کھنڈر۔

چنار کی لکڑی جلانے سے ایک عجیب بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔ اس کے کوئلہ کی آگ بڑی دیرپا ہوتی ہے صدیاں گزر چکی ہیں لیکن وہ آج بھی عہد ماضی کی تاریخ دہراتے ہیں۔ ان کی عمر، خضر کی عمر سے کم نہیں ہوتی۔ جہانگیر نے یہ درخت ایران[1] سے منگوا کر لگوائے تھے جو آج بھی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔

یوں تو کشمیر کے گوشے گوشے میں باغ ہی باغ تھے۔ مگر شالامار باغ، باغ اچھابل، ملا شاہی باغ، نشاط باغ کو چھوڑ کر سب تاراج ہو چکے ہیں۔"

محمد جو نے بڑی دیر کے بعد ایک گہری سانس لے کر اپنی متوالی روشن آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت اس کی صورت پر ایک عجیب کیفیت چھا گئی تھی۔ اس کے یونانی خد و خال بڑے دلکش اور حسین معلوم ہو رہے تھے لمحہ بھر کے بعد اس نے نیم وا آنکھوں سے دریا کی جانب

---

[1] ایران اور کشمیر کے علاوہ چنار دنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔

دیکھ کر کہا۔

"کشمیر میں چار بڑی جھیلیں ہیں مانس بل، ویلر، ہرمکہ گنگا اور سد۔ سے بڑھ کر ڈل جس کے کنارے عہد رفتہ کی یادگاریں ہماری قدیم روایات کی منہ بولتی تصویر پیش کرتی ہیں۔ اسی کے کنارے پر حضرت بل ہے جہاں مسلمانوں کے عہد کی عمارتیں آج بھی کھڑی ہوئی ہماری زبوں حالی کا مضحکہ اڑا رہی ہیں۔ نسیم باغ، نشاط باغ تخت شاہی اور بالاحصار، چشمہ شاہی اور پری محل!

ڈل میں جو لمبی گھاس پیدا ہوتی ہے۔ اس کی نہائت عمدہ چٹائیاں بنا کر پانی پر بچھا دیتے ہیں۔ پھر مٹی ڈال کر تخم ریزی کرتے ہیں اور کثرت سے ہر قسم کی ترکاریاں پیدا ہوتی ہیں کاشتکاروں کا جب جی چاہتا ہے اپنی چٹائی کے کھیت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے رہتے ہیں۔"

"خوب! بعینہٖ ایسا منظر مشرقی پاکستان میں بھی تو پایا جاتا ہے اور عجیب بہار دیتا ہے۔"

محمد جو نے پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "دنیا میں یوں تو ہزاروں خوبصورت اور دلکش باغ ہوں گے۔ لیکن جو دلکشی اور خوبصورتی اور نظارہ شالامار باغ کا ہے وہ شاید ہی کہیں اور ہو۔۔۔۔ اس کا ذکر کروں تو کیسے جب اس کا نام لیتے ہی دل سے ہوک سی اٹھتی ہے۔

محمد جُو خاموش ہوگیا ۔ میں نے دیکھا کہ چاروں طرف وہی سناٹا تھا اور ابھی تک دھوپ کی تپش کم نہ ہوئی تھی ۔ کبھی کبھار ہوا کی ہلکی سی لہر سے درختوں کے پتے بجنے لگتے تھے ۔ اتنے میں محمد جُو بولا ۔ " پہلگام کا نام تو سنا ہوگا ۔"

" سنا تو ہے ، مگر دیکھنے کی تمنا ہے " میں نے جواب دیا ۔

محمد جُو مسکرایا کہنے لگا ۔ " خدا تمہیں وہ دن نصیب کرے ! پہلگام سری نگر سے باسٹھ میل دور ہے اور چھ سو فٹ بلندی پر واقع ہے ۔ یوں تو راستے میں کئی پُر فضا مقامات ملتے ہیں ۔ لیکن پام پور جو میرا وطن ہے ۔ قدرت نے اسے ایسا معطر اور پُر فضا بنایا ہے کہ انسان جنم جنم کا دکھ بھول جاتا ہے ۔ پام پور ! ـــــ زعفران کے سدا بہار کھیتوں کی دنیا ـــــ ماہ اکتوبر میں جب زعفران کے پھول کھلتے ہیں تو مت پوچھو اس وقت کتنا بھلا منظر ہوتا ہے ۔ زعفران کے بالشت بالشت بھر کے پودے ، ان پر کاسنی رنگ کے پھولوں کے گچھے پتے پیاز کے پتوں کی مانند ، زرد زیرے اور تین تین سرخ لمبی لمبی کاڑیاں[1] ، کمانیں بنائے لٹکا کرتی ہیں ۔ جیسے کوئی پھولوں کا فانوس فرش زمین پر رکھا ہے ۔ یہی لمبی لمبی کاڑیاں زعفران ہوتا ہے ۔ نومبر

---

[1] دکاڑی دکنی زبان میں کہتے ہیں چونکہ تیلی سے میرا مفہوم پورا نہیں ہوتا ۔ اس لئے میں نے کاڑی کو اپنا لیا ہے !

میں زعفران کے کھیت کاٹے جاتے اور پھول چُنے جاتے ہیں۔ سینکڑوں مرد، عورتیں اور لڑکے لڑکیاں، کھیتوں میں تتلیوں کی مانند کام کرتی ہیں۔ پھولوں اور زعفران کے معطّر شگوفوں اور کاڑیوں کو اپنی جھولیوں میں بھرتے ہیں۔ فضا میلوں معطّر ہو جاتی ہے۔ انہیں زعفران کے ایک کھیت میں، میں اور جگری بچپن میں کھیلتے نکل آئے تھے۔ جگری رحیتی کی بڑی بہن تھی، بڑی خوبصورت جیسے زعفران کا پھول۔ زلفیں کالی بھونرا، آنکھیں جیسے ڈل جھیل — ہمارا بچپن بڑی سرعت سے بیت گیا۔ جب جوانی کی شادابیوں نے انگڑائیاں لیں تو ہماری شادی ہو گئی . . . . " اتنا کہہ کر محمد جو کی آواز بھرا گئی۔

میں نے کہا۔ "جگری بے چاری تو ملکِ عدم کو سدھاری مگر اس کی یاد تمہارے عزائم کی رہبری کر رہی ہے . . . . . بڑھے چلو . . محمد جو ابھی ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

محمد جو جیسے جھرجھرا کے پھر مسکرانے لگا۔ وہ بڑا جذباتی آدمی تھا اور اس کے جذبات مدوجزر کی مانند ابھرتے اور مٹ جاتے تھے۔ اس نے مجھے بڑی شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگا۔ "تمہاری باتیں بڑی حوصلہ افزا ہوتی ہیں . . . . باتوں باتوں میں نجانے کیوں مجھے جگری یاد آگئی . . . . میری جگری زعفران کا پھول تھی اور جس طرح پھول کی زندگی چند دن بہار دکھانے کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور اپنی خوشبو اور تازگی کا اثر اتنا گہرا چھوڑ دیتی ہے کہ کئی دنوں

تک انسان اس کے احساس سے طمانیت محسوس کرتا ہے اسی طرح مجھے اس کی یاد میرے اعصاب میں زندگی اور عزم کی لہریں پیدا کر دیتی ہے"۔

محمد جو نے پھر دریا کے جانب اشارہ کر کے کہا۔ "چناری کے اس پار میرے خوابوں کے شبستاں آج بھی روشن ہیں۔ میرے وطن پام پور میں خواہ جو بھی حشر ہوا ہو۔ لیکن ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ میں وہاں پہنچ کر اپنی سوئی ہوئی یادوں کو جگاؤں گا۔" پھر توقف کے بعد بولا "ایک دفعہ میں گاندربل میلے کے دنوں میں گیا تھا، دریائے جہلم میں چوبی مکان، کشتیاں، ڈونگے، مسافروں سے بھرے گاندربل کی طرف رواں دواں تھے۔ مانجھی طرح طرح کی بولیاں "یا کھدا" یا "جہانگیر پاچھا" (بادشاہ) یا "مولا" یا "پنج تن" بولتے ہوئے اپنی کشتیاں چوبی مکان کھے رہے تھے اور اپنے لمبے لمبے بانسوں کو بار بار دریا کی تہہ میں گرڈ دیتے۔ ان کی ایک ساتھ آواز کی گونج سے ایسا معلوم ہوتا کہ سینکڑوں آدمی کسی گنبد میں بیٹھے ہوئے زور زور سے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ بالکل مشرقی پاکستان کا منظر . . . گاندربل کے میلے کی رونق اور چاندنی رات کا منظر عمر بھر نہیں بھول سکتا۔

کشمیر کی سب سے بڑی، پُرشکوہ، دلکش اور پُرفضا جھیل مانس بل، گاندربل سے کوئی نو میل دور ہے اس کی تہہ کا آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ اس سے تھوڑی دور نور جہاں کا لگوایا ہوا جھروکہ باغ تھا۔ لیکن اب چاروں طرف دھان کے کھیت ہی کھیت نظر

آتنے ہیں۔

جھیل مانس بل قدرت کا شاہکار ہی نہیں بلکہ اس کے سینے میں عشق حقیقی کے سربستہ راز بھی پوشیدہ ہیں۔ ایک "لالہ رخ" ہی کیا، نجانے کتنی شگفتہ اور نوخیز حسن و محبت کے مسکراتے ہوئے کنول اس کی ہر دم انگڑائیاں لیتی ہوئی لہروں کے سپرد ہو چکے ہوں گے۔ روایت ہے کہ "لالہ رخ" کو ایک فرانسیسی سے عشق ہو گیا تھا۔ جو کسی زمانے میں جہانگیر کے دربار میں سفیر کی حیثیت سے آیا تھا۔ اس عشق کی دیوانگی نے "لالہ رخ" اور اس بدیسی عاشق کو جھیل مانس بل نے اپنے آغوش میں لے لیا۔ دونوں نے اسی جھیل کے ایک مختصر جزیرے میں پناہ لی تھی۔ لیکن اب نہ تو وہ لالہ رخ ہی رہی اور نہ اس کا عاشق اور نہ وہ جزیرہ ہی باقی ہے جو مانس بل کے کسی حصے میں تھا۔ تاہم آج بھی لالہ رخ کا نام سن کر جھیل کے مسکراتے ہوئے سرخ کنول یاد آجاتے ہیں جو شاید اسی کی خون آشام محبت کا مظہر ہیں۔"

محمد جو پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس ذوق و شوق کے عالم میں کشمیر کے متعلق سب کچھ کہہ دینا چاہتا ہے۔ "لالہ رخ کے معاشقہ کی داستان چھیڑ کر اس نے مجھے ایسا متوجہ کیا جیسے ہم دونوں جھیل مانس بل کے کنارے بیٹھے ہوئے لالہ رخ کی فرضی خوبصورتی کا نظارہ کر رہے ہیں۔ لیکن جب اس نے اس دلچسپ داستان کو یکایک ختم کر دیا تو میرے دل پہ ایک

دھچکا سا لگا۔ اور میں نے بڑے مضطرب انداز سے دریافت کیا "یہ لالہ رخ تھی کون ...... اور اس کا انجام کیا ہوا؟ ... کہانی تو نام ہی سے شروع ہو گئی تھی لیکن ... بات ادھوری گیا.. ابھی شروع ہوئی تھی کہ تم نے آنے والے واقعات پر یکایک خاموشی کا پردہ ڈال کر اس کی دلچسپی کو ختم کر دیا۔؟"

محمد جو میری بات سن کر بہت زور سے ہنسا۔ پھر یکایک اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ لمحہ بھر توقف کے بعد بولا "بہتر ہے کہ اس قصّے کو یہیں رہنے دو۔ چناری کے اس پار، ان حسین و گلپوش وادیوں میں ایک لالہ رخ کیا لاکھوں لالہ رخیں نہ جانے کیسی کیسی آنچوں سے جھلس رہی ہیں۔ ان کی افسوسناک حالت ہمارے لئے ذلّت اور رسوائی کا طوق ہے۔ ہمارے لئے بہتر ہے کہ ان مقید شہزادیوں کے لئے جو مدتوں سے ہماری راہ دیکھ رہی ہیں، ذریعۂ نجات ثابت ہوں۔ ان لالہ رخوں کو ان کی قدرتی آزادی سے بہرہ ور کرائیں جن کی آرزو زندگی بھر میرے دل میں قائم و دائم رہے گی۔ اور اگر میری تمنائیں یونہی ادھوری رہ گئیں تو میرے لئے اس زندگی سے بہتر پہاڑ سے ٹکرا کے مر جانا ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

محمد جو کے پُر جوش عزم اور ارادوں کی جولانی کا حال دیکھ کر جیسے میرے ذہن کے گنبد میں روائتی لالہ رخ کی بجائے جیتی جاگتی لالہ رخوں کی درد و کرب سے بھرپور صدائیں گونجنے لگیں۔ دل میں جیسے زبردست

آگ بھڑک اٹھی تھی اور جی چاہ رہا تھا کہ ایک ہی جست لگا کر جہلم کے اس پار لانگ جاؤں اور ان افسانوی شہزادیوں کو موج ہوا کی طرح آزاد کر دوں جو دیوؤں کے پنجۂ استبداد میں کراہ رہی ہیں یا ہوش و حواس سے بیگانہ ہیں، بے بس ہیں!

ابھی میں جوش و وحشت میں گم نہ جانے کیا سوچ رہا تھا کہ محمد جُو بولا۔

"بس اب تیار ہو جاؤ . . . . چار بج چکے ہیں، ہمارے ساتھی ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے!" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

میں بھی بغیر کچھ کہے اس کے ساتھ ہو لیا۔ مگر ابھی تک مجھ پر وہی مجنونانہ کیفیت طاری تھی اور ہم دونوں خاموش ادھر ادھر دیکھتے بڑھے جا رہے تھے کہ اتنے میں ایک فوجی دستے نے ہمیں آگے بڑھ کر گھیر لیا۔

فتح باغ کے ویرانوں میں!

دوپہر کے گہرے سناٹے میں ویران، اداس ٹیلوں پر جیسے موت کی دہشتناک پرچھائیاں چل پھر رہی تھیں آس پاس ایک ہُو کا عالم تھا۔ لیکن جب نیم گرم ہوا کے جھکّڑ سرسراتے ہوئے چلنے لگتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے سینکڑوں زخموں سے نڈھال انسان تپتے ہوئے ٹیلوں کے درمیان پڑے سسک رہے ہیں۔ میں بڑی دیر تک فتح باغ کی خاک و خون میں ڈوبی ہوئی داستان کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیکن یہ کوئی انوکھی داستان نہ تھی، بلکہ وہ بھی قدیم تاریخی داستانوں جیسی تھی جن سے دنیا کی تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اپنے گردوپیش ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور دل میں کہا، کارتھیج، ٹرائے، بے بیلون اور نانینیوہ جیسے

پرانے شہروں کو فنا ہوئے ہزاروں برس بیت چکے ہیں مگر فتح باغ کو مٹے ابھی کون سی صدیاں گزر گئی ہیں، جسے زمانہ یکسر بھلا بیٹھا۔''
یہ سوچ کر جیسے ایک جھرجھری سی معلوم ہوئی اور مدفون شہر کے ٹیلے پر رہنے والے لوگوں پر بڑا غصہ آیا۔ لیکن جب میں نے اپنے ملاقاتی گدڑ فقیر کو اپنے قریب بیٹھے پایا تو جیسے دل کا غبار خود بخود چھٹ گیا تھا اب اس ٹیلے پر جہاں کسی زمانے میں پُررونق شہر ہوگا۔ گھاس پھوس کے صرف چند گھر تھے اور چاروں طرف ویران ٹیلے۔ ایک اذیت ناک خاموشی اور افسردگی طاری تھی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اپنے ساتھی سے باتیں چھیڑ دیں۔

میں نے کہا۔ ''گدڑ سائیں تمہیں فتح باغ کے اُجڑنے کی کہانی بھی یاد ہے؟''

یہ سن کر حبشی نژاد سو سالہ بوڑھے کے چہرے پر سنجیدہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے بڑی مشفقانہ نگاہوں سے مجھے دیکھ کر جواب دیا۔

''میرے نوجوان مسافر! آج تم نے بڑی بھولی بسری یاد تازہ کر دی۔ خدا کی شان ہے جہاں ہم آج بیٹھے ہوئے ہیں یہاں کسی زمانے میں بڑا خوبصورت شہر آباد تھا۔ یہی دو سو سال پہلے کی بات ہے
میں نے کہا۔ ''اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے۔ لیکن اس کی تباہی کے اسباب کیا تھے۔؟''

"وہی انسانی ہوس، اقتدار لوٹ مار اس شہر کی تباہی کا پیش خیمہ تھے۔" گدو نے ایک لمبی سانس لے کر جواب دیا اور پھر بولا:-

"کلہورہ کے آخری حکمراں میاں عبدالنبی جو نواب سندھ کے نام سے مشہور تھا۔ اسی کے زمانہ میں یہ شہر تباہ ہوا۔ نواب بڑا بزدل تھا اور عیش و طرب کی وجہ سے بڑا بدنام ہو گیا تھا۔ اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلوچی سردار فتح علی خاں تالپور نے چڑھائی کر دی اور ملہنائی کے مقام پر نواب اور سردار میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ آخر نواب شکست کھا کر کابل بھاگ گیا"

"کابل؟"

"ہاں — کابل پہنچ کر اس نے والیٔ افغانستان سے مدد حاصل کی اور افغان جرنیل عزت یار خاں نے دوبارہ اس کی کھوئی حکومت بحال کر دی۔ لیکن ابھی اسے کابل واپس ہوئے تھوڑے ہی دن گزرے ہوں گے کہ بلوچی سردار فتح علی خاں تالپور نے نواب کو پھر مار بھگایا آخر نواب کو پھر شاہ افغانستان کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغلوں کی سلطنت کا چراغ دہلی میں ٹمٹما رہا تھا۔ ادھر سندھ پر افغانوں کا زور بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ اس دفعہ شاہ افغانستان نے نواب عبدالنبی کی اس شرط پر مدد کرنے کا وعدہ کیا کہ وہ اسے بھاری خراج ادا کرے گا۔

نواب کے لئے اب یہی چارہ تھا کہ وہ اس شرط کو منظور کرے۔ چنانچہ افغانستان کے بادشاہ نے اپنے ایک آزمودہ ز. جرنیل مدد خاں کو نواب کے ہمراہ بھاری فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ مدد خاں نے سندھ پہنچکر نواب کو بڑی آسانی سے اس کی کھوئی حکومت بحال کردی۔ لیکن ادھر مدد خاں کی آمد کی خبر سن کر فتح علی خاں تمام قیمتی ساز و سامان اور خزانہ لے کر فرار ہو گیا تھا چنانچہ جب مدد خاں واپس کابل ہونے لگا، تو اس نے نواب سے خراج طلب کیا تو نواب بڑا سٹپٹایا۔ خزانہ بالکل خالی تھا اور کوئی صورت ایسی نہ تھی کہ وہ مدد خاں کو ٹال سکتا۔ آخر کئی روز کے انتظار کے بعد مدد خاں کی فوج رسد کی کمی کی وجہ سے فاقہ کرنے لگی۔ اس پر مدد خاں بڑا بگڑا۔ خود غرض اور بزدل نواب کو جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو اس نے مدد خاں کو مشورہ دیا کہ وہ لوٹ مار کر کے خراج وصول کر لیئے۔"

اندھا کیا مانگے دو آنکھیں۔ مدد خاں کے لیئے نواب کا اتنا اشارہ بہت کافی تھا۔ چنانچہ اس کی ٹڈی دل فوج شہر، گاؤں بستی جو سامنے آیا تخت و تاراج کرتی چلی گئی اور لوٹ مار اور قتل و غارتگری کا ایک ایسا ہولناک کھیل شروع ہو گیا کہ ہزاروں بے گناہ پر امن عوام موت کی نیند سلا دیئے گئے۔ ان کی عزت و آبرو، مال و دولت غرض کہ سب کچھ لوٹ لیا گیا اور اس طرح وادئی سندھ کے کئی خوبصورت

پر رونق شہر جن میں فتح باغ، جون، بدین، چھاچھرو اور ناصر پور قابلِ ذکر ہیں، یہ سب نذرِ آتش کر دیئے گئے اور اب ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں۔

گدّو نے پھر ایک لمبی سانس لے کر چاروں طرف دیکھا اور کہنے لگا:۔

آج فتح باغ کی خوبصورتی کا کوئی تصور نہیں کر سکتا۔ کسی زمانے میں یہ مقام سندھ کا نہائت مشہور صنعتی مرکز تھا۔ اس کی خوشحالی، دلکشی، سرسبز باغات، رسیلے پھل اور مصنوعات دور دراز تک مشہور تھیں۔ اس وقت دریائے سندھ جو اب یہاں سے (دس کوس پرے ہے) شہر کے دامن سے لپٹا ہوا بہا کرتا تھا۔ دریا کے کنارے مال بردار کشتیاں لنگر انداز رہا کرتی تھیں جن کے ذریعہ یہاں کی بنی ہوئی سینکڑوں چیزیں دور دور مقامات پر بھیجی جاتی تھیں تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے لوگ بڑے خوشحال تھے اور بڑی پُرامن زندگی بسر کرتے تھے مگر آج اس پُر رونق شہر کی بجائے حسرت برستی ہے۔ یہ ہے اس شہر کی تباہی کی کہانی۔"

اتنا کہہ کر گدو اپنی لاٹھی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا میں اپنی جگہ خاموش تھا اور میرے ذہن میں اس وقت چیونٹیاں سی چل رہی تھیں میں نے کھڑے ہو کر سامنے نگاہ اٹھا کے دیکھا تو ویرانوں سے پرے دھان کے سبزہ زار لہلہا رہے تھے۔ کہیں کہیں آم کے پرانے درختوں

کے دو چار جھنڈ بھی تھے جن کے گھرے سائے میں حیات آفریں طمانیت اور سکون چھایا ہوا تھا۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک مسجد کے کھنڈر کی طرف نکل آئے۔ جس کے صدر دروازہ کی نصف کمان باقی رہ گئی تھی جو اینٹ اور چونے کے ایک مضبوط ستون کے سہارے کھڑی تھی کمان کے اتنے حصّے میں نہائت چمکیلی ٹائلیں جڑی ہوئی تھیں۔

گدّو بابا نے اس شکستہ کمان کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

" یہ اکبری عہد کی ایک یادگار مسجد تھی جس کے ایک سو گنبد تھے میں نے اپنی جوانی میں جب اس مسجد کو دیکھا تھا تو اس وقت تقریباً ٹھیک حالت میں تھی۔ لیکن اب تو یہ بھی زمانہ کی چکی میں پس کر خاک کا ڈھیر بن چکی ہے۔"

گدو کا یہ جملہ سن کر مجھے مسجد قرطبہ کے ویران اور اداس در و دیوار یاد آ گئے اور علاّمہ اقبال کی نظم جیسے میرے کانوں میں گونجنے لگی میں نے مسجد کے شکستہ کھنڈر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا جہاں اب چاروں طرف اینٹوں اور ٹائلوں کے اونچے ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھا اور اس کھنڈر کے علاوہ کسی اور عمارت کے نشان باقی نہ تھے بس ہر طرف ٹیلے ہی ٹیلے تھے جن پر ریت کی سفید چادریں چڑھی ہوئی تھیں۔

مسجد کے کھنڈر سے ہوتے ہوئے ہم اس ویرانے کی طرف

نکل آئے جہاں کسی زمانے میں راجہ بیربل کا گھر تھا۔ گدّو نے بڑے یقین سے بتایا کہ اکبر کے درباری نورتنوں میں راجہ بیربل، تان سین اور گاگ بھٹ فتح باغ میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی تھی پھر گھومتے گھامتے ہم مدفون شہر کے ایک ویران شاہ راہ پر نکل آئے جو ویران ٹیلوں کے بیچوں بیچ سیدھی سپاٹ تقریباً ایک میل تک چلی گئی تھی۔

اسی شاہراہ پر مغل حاکم کی محلسرا تھی جس نے بے رحم حملہ آوروں سے فتح باغ کے بچانے کے لئے اپنے لہو کا آخری قطرہ بھی بہا دیا اور دوسرے مظلوم انسانوں کی طرح وہ بھی فنا کی گود میں سو گیا۔

اس شاہراہ کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر جب میں نے فتح باغ کے ماضی کا تصوّر کیا تو جیسے میری نگاہوں کے سامنے سچ مچ اس کی تصویر اُجاگر ہو گئی۔ ۱۷۶۷ء سے کچھ پہلے اس شہر کے پر رونق گلی کوچے، بازار، دلکش باغات، ڈیوڑھیوں اور حویلیوں کا تصوّر کر کے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں جنت کے کسی گوشے میں پہنچ گیا ہوں۔ لیکن پھر یکایک ان ویرانوں کا خیال آتے ہی میرے کان دردناک چیخ و پکار سے گونج اٹھے، تلواروں کی کھٹا پٹ، بندوقوں اور توپوں کی بھیانک آوازوں کے درمیان عورتوں بچوں اور بوڑھوں کی دردناک آہیں، سسکیاں، اور رونے پیٹنے کی درد بھری صدائیں سے زمین و آسمان کے گنبد میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ نگاہوں

کے سامنے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے آن کی آن میں ساری دنیا ہوس، اقتدار اور ظلم کی آنچ میں جل کر ہمیشہ کے لئے بھسم ہو جائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی جیسے کسی نے مجھے زور زور سے جھنجھوڑا لیکن جب میں نے گھبرا کر اپنے آس پاس دیکھا تو چاروں طرف خاموشی تھی، ویرانے تھے اور اداسی تھی اور سرسراتی ہوا میں جیسے کوئی گنگنا رہا تھا ؎

کتنے شب رنگ خیالوں کے منقش محراب
گرمیٔ وقت کی رفتار سے کجلا سے گئے
کتنے گلنار تصوّر کے سحر تاب محل
ان حوادث کے گراں تیشوں سے مسمار ہوئے

کوئی خاموش فضاؤں میں گنگناتا ہوا گزر گیا۔ اب میں نے نظر دوڑا کے دیکھا تو گدّو بابا مجھ سے کافی دور ایک ویران ٹیلے کے قریب کھڑا میری راہ تک رہا تھا۔

نمائش

آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے!

قلعۂ لاہور کے صدر دروازہ پر ہلالی پرچم لہرا رہا تھا اس جھنڈے کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوا، جیسے تاریخ اسلامی کی ساری کہانیاں نگاہوں کے سامنے چل پھر رہی ہیں۔ وہی کہانیاں جو بزم و رزم کے قصوں سے بھری پڑی ہیں جو شہنشاہوں کے جنگی کارناموں کو دہراتی ہیں اور فتح و نصرت کے شادیانے بجاتی ہیں، تو قلعہ کی دیواریں نعرۂ تکبیر کی فلک شگاف صداؤں سے گونج اٹھتی ہیں۔ کبھی اس قلعہ میں وہ شہسوار چغتائی"۔ جہانگیر نے دربار کیا تھا۔ جشن منائے تھے۔ کبھی فوجوں نے قیام کیا

تھا۔ اس قلعہ کے ارد گرد توپوں کی گونج سے دل لرز جاتے تھے، تلواروں کی جھنکار سے حریفوں کے سینے تھرتھرا اٹھتے تھے۔ یہ ساری کہانیاں اور جشن و مسرت کے افسانے تو اب گلدستہ طاق نسیاں بن چکے ہیں۔ کیونکہ ان کی دلچسپیاں، ان کی رنگینیاں تاریخ ہی کے نہاں خانوں میں پوشیدہ ہیں لیکن ۳۰ دسمبر ۵۷ء اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایک ایسی بہارِ گل بداماں، ایسی جنت نگاہ اور فردوسِ گوش گہما گہمی لے کر آیا جو بجائے خود ایک تاریخی حیثیت کی حامل ہے اور ہم اس کے غلغلوں سے مدت تک لذت گیر ہوتے رہیں گے۔ یہ تھی اسلامی نوادر کی بین الاقوامی نمائش جس میں رزم کی بجائے بزم، شانِ جلالی کی بجائے ملتِ اسلامیہ کی شانِ جمالی کارفرما تھی۔

یہ نمائش اس مذاکرۂ اسلامیہ کا ایک دل فریب پہلو تھی جس کے علمی ہنگامے قلعہ لاہور، شاہی مسجد، اور مزار اقبال رح سے کافی دور جامعۂ پنجاب کے وسیع اور کشادہ ہال میں پورے دو ہفتے بپا رہے اور اس اہتمام کے ساتھ کہ ع

ہوئے بہرہ مند تماشائی

اس تاریخی تقریب کے لئے "دلفریب" ہی کا لفظ موزوں ہے کیونکہ اس کا تعلق تمام تر فنونِ لطیفہ سے ہے یعنی مسلمان اقوام کے فنی نوادر سے جو دنیا کے ہر ہر گوشہ سے فراہم کرکے پہلی دفعہ

یکجا پیش کئے گئے اور ایسے ماحول میں جس کے ذرہ ذرہ میں اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلمانوں کے دور عروج ہی کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ اس نمائش کے لئے شہنشاہ جہانگیر کے تعمیر کردہ چوگوشہ احاطہ کو منتخب کیا گیا جو قلعہ لاہور کی خوبصورت عمارتوں میں ایک پیکر زیبائے حسن ہے۔ حسن و کیف، تاریخ و تہذیب کی اس مثالی فضا میں اسلامی نوادر کی نمائش کا افتتاح اس اہتمام سے ہوا جو اس عدیم النظیر تقریب کے شایانِ شان تھا۔ یہ نمائش اسلامی فن اور کاریگری کی پہلی نمائش ہے جس میں دنیا کے تقریباً تمام مشہور ملکوں نے حصہ لیا۔ اسلامی ملکوں میں ایران، ترکی، انڈونیشیا اور پاکستان اور غیر اسلامی ملکوں میں برطانیہ، فرانس جرمنی، امریکہ، اٹلی اور روس شامل تھے۔ اس طرح یہ نمائش تین براعظموں سے آتے ہوئے نوادر پر مشتمل تھی۔ برطانیہ کے سر ایلڈرڈ بیچ کاک نے اسلامی ظروف سازی کے نادر نمونوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا جو اس نمائش میں پیش کیا گیا۔ پاکستان کی طرف سے مشہور شہروں، ڈھاکہ، پشاور، لاہور، بہاولپور اور دیگر مقامات سے کئی چیزیں نمائش میں لائی گئیں۔ ان کے علاوہ بخارا، بغداد اور قم جیسے اہم مقامات کے نوادر بھی اسلامی فن کاری کی بوجہ احسن عکاسی کر رہے تھے۔

اسلامی عہد کی فنکاری کے نمونے دنیا کے جس حصے میں بھی ملتے

ہیں انہیں دیکھ کر فوراً نگاہوں کے سامنے اسلامی تمدن و تہذیب اور معاشرت کی تصویر کھنچ جاتی ہے کوئی ایسی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی جو فنی نقطۂ نظر سے اختلاف خیال کی بنیاد بن جائے گویا اسلامی تمدن کی داغ بیل اتنی پختہ اور ہم رنگ ہے کہ اسے ملک اور فاصلہ کے اعتبار سے کسی طرح جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی فن پاروں میں ایک ہی رخ ایک ہی تصور جھلکتا ہے۔ــــــ

اس نمائش میں ان قالینوں کو دیکھئے جو بیسیوں اقسام اور بناوٹ کے تھے۔ کسی میں شالامار باغ کا نقشہ کھینچا تھا تو کسی میں شکار کا نقشہ پیش کیا گیا تھا، چاروں طرف فطرت کی گوناگوں خوبصورتیاں اجاگر کی گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شکار سچ مچ ہماری نگاہوں کے سامنے کھیلا جا رہا ہے، ایک قالین میں پھولوں کی چادر بچھی ہوئی تھی اور پھول پتیاں اپنی بہار دکھا رہی تھیں ایرانی قالین پر ایک چیتے کے خوفناک حملے کا نقشہ کھینچا تھا ایک اور قالین میں چنار کے درخت پر خوش الحان چڑیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ترکی کے قدیم شاہی دربار کی ایک جانماز بھی نمائش کی زینت تھی۔ اس کے پھولوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بادِ بہار نے ان کے رخساروں کا بوسہ لیکر خوب رنگ آمیزی کردی ہے۔ لاہور کے ساختہ قالین کے نمونے جھاڑی کی ابھرتی ہوئی شاخوں اور پتیوں کی بناوٹ ایسی تھی جیسے سچ مچ ہری بھری جھاڑی ہمارے

نگاہوں کے سامنے آگئی ہوئی ہے۔ قالینوں کی کاری گری اور فنی دلآویزی میں یکساں رنگ جھلک رہا تھا۔ فرق صرف تصویر کی رنگ آمیزی اور ماحول کی شوخیوں ہی کا تھا۔ ہر قالین خیال اور فن کے اعتبار سے ایک علیحدہ دلفریب ٹکڑا تھا یہ فنکارانہ خوبیاں اور پھر اسلامی تخیلات کی یکساں جھلک اس بات کی دلیل ہے کہ ان دور دراز اسلامی ملکوں کے درمیان اتحاد اور ملّی رشتے ہمیشہ بڑے مضبوط رہے ہیں اور ان کی چلتی پھرتی تصویریں ہم آرٹ کے آئینے میں بھی بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ فنّی حیثیت سے ان کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ ان کے انداز پیشکش میں کوئی فرق نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان میں سپاٹ یکسانیت اور ہم وضعی ہے بلکہ موضوعات مقامی رنگ، تصور، اور طرح سب میں غیر معمولی تنوع ہے۔

قالینوں کے علاوہ اور کئی چیزیں بھی تھیں جو فنکاروں کے گہرے جذبات اور لطیف احساسات کا مرقع تھیں۔ ان میں کائناتی حسن تھا خوبصورتی اور دلکشی تھی اور انہیں دیکھ کر دل چاہتا تھا کہ ان فنکاروں کے ہاتھ چوم لیے جائیں یہ فنّی معجزے ایسے ہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں بالخصوص وہ جن کے ساتھ خاص خاص قومی یا دینی بھی وابستہ ہیں ان اشیاء اور نوادر کی خوبصورتیوں کا مشاہدہ ان کے تذکرے سے کہیں بہتر ہے لیکن جن لوگوں نے اس تاریخی نمائش کو نہیں دیکھا ان کے لئے یہ کیا کم

ہے کہ ان فنکارانہ تخلیقات کا تذکرہ کر کے انہیں تھوڑی دیر سوچنے کا موقع دیا جائے کہ اسلامی آرٹ نے دنیا میں ایک خاص انفرادی جگہ پیدا کی ہے۔ ان آنکھوں دیکھی چیزوں کا حال سپرد قلم کرتے ہوئے خلیفہ ہارون الرشید کے عہد کے ایک درخت کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ کہتے ہیں کسی نے ہارون الرشید کے محل کے باغ میں ایک سونے کا درخت بنایا تھا، اس کی شاخوں پہ خوبصورت پرندے بنے ہوئے تھے جن کی آنکھیں لعل دیاقوت کی تھیں چونچیں زمرد کی بنائی گئی تھیں اور پَر ہیرے کے تھے۔ کاش! فنکارانہ حسن و تخلیق کی یہ قدیم یادگار ہمارے سامنے ہوتی لیکن اب تو صرف تاریخ ہی میں اس کا تذکرہ ملتا ہے، اس کی ندرت اور طرفہ کاری کا تصور ہی ایک جنّت خیال ہے جو اپنے اندر ایک طلسماتی کیف لئے ہوئے ہے حقیقی مشاہدہ کے کیف و اثر سے کہیں ارفع و اعلیٰ اور لطیف تر! کیا وہ تمام نوادرات جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں باہم مل کر ایک ایسے ہی زرّیں و مرصع شجر کی کیفیت پیش نہیں کرتے۔؟

اسلامی فنون کی اس بین الاقوامی نمائش میں دو چیزیں خاص توجہ کا باعث تھیں۔ ایک وہ یاقوت رمّانی جو سلطان شہید ٹیپوؒ کے خنجر کے دستہ میں جڑا ہوا تھا۔ یہ خنجر امیر بھاولپور نے پیش کیا تھا۔ یہ اس مردِ مجاہد کی کس قدر اثر آفریں اور ساتھ

ہی رقت آفریں یادگار تھی!

شہر قم (ایران) سے امام رضا علیہ السلام کی ہمشیرہ کے مزار کا قالین آیا تھا جو قالینوں کی بناوٹ اور کاریگری کا بے مثال نمونہ تھا۔ یہ قالین اس وقت دنیا کے خوبصورت ترین قالینوں میں شمار ہوتا ہے۔ ویسے بھی قم دنیا بھر میں قالینوں کا بہترین مرکز تسلیم کیا جاتا ہے ان کے علاوہ اور بہت سی چیزیں بھی تھیں جو فن کاروں کے لئے خاص دلچسپی کا سامان مہیا کرتی ہیں اور ان کے ذہن میں پھر سے قدیم روایات کی جوت جگا کر ایک نئی لگن پیدا کرتی ہیں اور تخلیق کو فکر و نظر کی نئی نئی راہیں سجھاتی ہیں۔ بعض چیزیں مثلاً سکے، قلمی نسخے، خطوط، نسخ و نستعلیق خطاطی کے نمونے، طغرے، عالموں اور فنکاروں کے لئے یکساں دلچسپی کا باعث تھے۔ سکوں میں شہنشاہ اورنگ عالمگیرؒ کا سکہ جس کا وزن اڑھائی سیر ہے، امیر بہاولپور نے پیش کیا تھا۔ اس کو دیکھ کر یک لخت اس مرد مجاہد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جو حقیقتاً "کش مارا خدنگ آخریں" کا مصداق تھا۔

یہ نمائش چند ہی دن قائم رہی۔ مگر اس طرح جیسے ویرانے میں یک لخت بہار آجائے۔ پُر اشتیاق تماشائی ہر روز جوق در جوق آتے اور اس کی گوناگوں دلچسپیوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یہ لطف محض دامان نظر ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ دل

کی عمیق ترین گہرائیوں میں اتر کر ایک پائیدار اثر چھوڑ گیا جو ہمیشہ
اہل فن کے وجدان میں محفوظ رہ کر نئے نئے احساسات، تصورات اور
فنی کوششوں کو جنم دے گا اور یہی اسلامی نوادر کی اس یادگار کا
بہترین حاصل ہے۔

قلعۂ ملتان کی ایک شام

نگار خانے میں خوب چہل پہل تھی اسکول اور کالج کے لڑکے اور لڑکیوں کے علاوہ اور بہت سے لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ لیکن ان تمام لوگوں میں جیسے میں ہی ایک اجنبی تھا۔ اور میں ان لوگوں کے درمیان انجان بنا ملتان کی مصنوعات اور دلکش تصویری شاہکاروں کی طرف متوجہ تھا۔ کبھی کبھار کسی کی شریر نگاہیں مجھے بیچین کر دیتیں اور اس وقت ایسا معلوم ہوتا جیسے دل کی سونی نگری میں بہار آفریں گھٹائیں اُمنڈ آئی ہیں۔

بڑی دیر تک نگار خانہ میں گھومتے گھامتے جب باہر نکلا تو اس وقت میری حالت اس تماشائی کی مانند تھی جس نے اپنا سب کچھ کسی کی نذر کر دیا ہے۔ ماحول کی چہل پہل نے پچھلی بہت سی بھولی

بسری باتیں یاد دلا دی تھیں۔ جوانی کی مسکراتی ہوئی صبحیں اور گلابی شامیں، بہت سارے جانے پہچانے لوگ گاؤں کی معطر فضائیں، کھیت کھلیان، سینکڑوں حسین مناظر، پر فضا مقامات ویرانے وادیاں، غرضیکہ ایسی نجانے کتنی بیشمار یادیں تھیں۔ درد بھرے اور شیریں گیت تھے، لوگ تھے اور سحر انگیز صبح اور شامیں تھیں، جن کی تفصیل اور بیان کے لئے صبر اور استقلال کی ضرورت ہے۔ اس وقت قلعہ ملتان کے اجڑے ہوئے ماحول میں ان تمام بیتی ہوئی باتوں کو یاد کر کے دل میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی اور ذہن میں قلعہ ملتان کی دو ہزار سالہ قدیم تاریخ کے رومانی واقعات کا دفتر کھلا ہوا تھا۔

قلعہ کے اس مقام کا تصور کر کے جہاں آج سے تقریباً ایک صدی قبل سورج دیوتا کے مندر کے علاوہ بہت سی خوبصورت عمارتیں اور عہد قدیم کی یادگاریں تھیں۔ مجھے ذرا تعجب ہوا اور ارد گرد کا ماحول کچھ عجیب بے ہول سا معلوم ہونے لگا۔ پھر چلتے چلتے یونانی تاریخ داں "ایرین" (ARIAN) کے روزنامے کی چند سطریں یاد آگئیں۔ ۳۲۶ء ق م میں جب اسکندر نے حملہ کیا تھا تو اس زمانے میں سورج دیوتا کے مندر کا پجاری قبیلہ "ملوئی"[۵]

---

۵ "ملوئی" آریہ نسل کا ایک قبیلہ۔

یہاں حکمراں تھا۔ اسکندر کو اس معرکہ میں بڑی مزاحمت کرنی پڑی تھی اور بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ یہاں تک کے جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ لیکن قسمت کی یاوری نے یہاں بھی اس کا ساتھ دیا۔

یونانیوں کے حملے کے ایک عرصہ کے بعد کے حالات کے بارے میں کہیں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ آگے چل کر اگر تاریخ کے کچھ حوالے ملتے ہیں تو وہ "چچ نامہ" کا معتبر تذکرہ ہے۔ لیکن قلعہ کے اصل بانی کا آج تک تاریخ میں کہیں سراغ نہ مل سکا۔ وادیٔ سندھ میں جب موہن جوڈارو اور ہڑپا کی تہذیب و تمدن پھل پھول رہا تھا۔ عالی شان عمارتیں اور انسانی آسائش کی تمام سہولتیں مہیّا تھیں۔ اگر اس دور کے آثار اور طرزِ تعمیر سے قلعہ ملتان کا مقابلہ کیا جائے تو پھر بھی اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی کہ یہ قلعہ بھی اس دور کی یادگار ہوگا۔ "چچ نامہ" سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب محمد بن قاسم نے وادیٔ سندھ پر حملہ کیا تو اس وقت سورج دیوتا کے مندر اور قلعۂ ملتان میں خوب چہل پہل تھی۔ جب عربوں نے قلعہ کا محاصرہ کیا تو برہمن راجہ نے بھی دفاعی مقابلہ کے لئے بڑی مضبوط مورچہ بندی کر رکھی تھی پھر اگلے روز سورج چڑھتے ہی زور شور سے جنگ چھڑ گئی۔ اسی دوران میں ایک شخص نے جان بچا کر قلعہ سے بھاگ نکلنا چاہا تھا کہ عربوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ پھر اسی شخص نے

دریا کی جانب قلعہ کی شمالی فصیل کی اس جگہ کا پتہ بتایا جہاں سرنگ آسانی سے کھودی جا سکتی تھی۔ چنانچہ عربوں نے ایک یہاں بہت بڑی سرنگ کھودی اور دو تین دن میں شہر پناہ کی دیوار گر پڑی اور قلعہ پر عربوں کا قبضہ ہو گیا۔

محمد بن قاسم کے حملے کے بعد یہ قلعہ جیسے ہمیشہ کے لئے خونریز جنگوں کا اکھاڑہ بن گیا تھا۔ ۱۰۰۶ء میں ابوالفتح داؤد اور لاہور کے راجہ انند پال متحد ہو کر سلطان محمود غزنوی کے خلاف بغاوت کرتے ہی قلعہ ملتان کی تاریخ کا پھر ایک بڑا دردناک دور شروع ہو گیا تھا۔ ابوالفتح کے اتحادی دوست انند پال کو پشاور کے مقام پر غزنوی فوجوں نے شکست دی۔ ابوالفتح نے قلعہ ملتان کو اپنا دفاعی مورچہ بنایا۔ لیکن سات دن کے محاصرہ کے بعد غزنوی فوجیں قلعہ پر قابض ہو گئیں اور پھر تقریباً پونے دو سو سال کے بعد ۱۱۷۶ء میں سلطان معز الدین محمد بن سام (شہاب الدین غوری) نے اس قلعہ پر اپنا پرچم لہرایا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد تاتاریوں نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ انہیں جنگوں میں بلبن کا بیٹا محمد شہید ہوا اور اس کے پیر و مرشد حضرت امیر خسرو دہلوی کو تاتاریوں نے گرفتار کر کے قید کر دیا اپنی اسیری اور قید و بند کی صعوبتوں کے خلاف احتجاج کرنے کی بجائے حضرت خسروؒ نے اپنے جذبات کا کتنے لطیف انداز

میں اظہار کیا ہے۔ ؎

من کہ بر سر نمی نہادم گل
باد بر سر نہاد دو گفتا ہل

دوپہر کے گہرے سناٹے میں ہر شئے دنیا کی بے ثباتی کا جیسے ماتم کر رہی تھی اور میرے قدم تنہائی کے احساس سے اور تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ قلعہ کے سب سے زیادہ پُر فضا اونچے سہ پشتہ، قلعہ بند، ٹیلے کی جنوبی فصیل کے ساتھ ساتھ دو بالاخانے بنے ہوئے نظر آئے۔ جنھیں قریب سے دیکھ کر قدیم طرز تعمیر کی خوبصورتیاں پھر اجاگر ہو گئیں۔ میں نے پہلے پشتے کے ۵ افٹ چوڑے بالاخانے پر چڑھ کر اپنی دوربین سے چاروں طرف دیکھا تو دور دور کے مضافات اور شہر کے خوبصورت منظر کی تصویر نگاہوں کے سامنے کھنچ گئی۔ شہر سے کوئی چار میل پرے دریائے چناب ایک لمبے سفید فیتے کی مانند سبزہ زاروں کے درمیان بل کھاتا ہوا دور بہت دور جیسے نیلگوں خلاؤں میں گھل مل گیا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اس قلعہ کو یوں تو بڑے بڑے فاتحین نے پامال کیا۔ لیکن آج سے تقریباً ساڑھے پانچسو برس پہلے تیموری لشکر کے حملے نے جیسے اس کی شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ جسے بعد میں مغلوں کے ساڑھے تین سو سال دورِ حکومت نے دوبارہ زندہ کر دیا تھا اور ساتھ ہی اسلامی

معاشرت، تمدن نے اس گوشہ میں اتنا عروج پایا کہ جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ جہاں زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی ہوئی وہاں بزرگان دین نے بھی اپنی برکتوں کے خزانے کھول دیئے تھے۔ آج بھی ان کے مزاروں کو دیکھ کر ان کے جاہ و جلال کا تصوّر تعظیم و ادب پر مجبور کر دیتا ہے۔ میں نے دور سے حضرت پیر بہاءالحق اور رکنِ عالم رح کے مزاروں کے گنبدوں کو دیکھ کر دل میں کہا۔ مگر مغل حکومت کے زوال کے بادل چھا گئے۔ جنوری ۱۸۱۸ء میں سکھوں کے اٹھارہ ہزار ٹڈی دل لشکر کا خیال آتے ہی میری نگاہوں کے سامنے اس سب سے بڑی آخری خونریز جنگ کا نقشہ کھنچ گیا جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

میں نے بالاخانے پر بیٹھے بیٹھے ایک طائرانہ نظر ڈالی تو یوں معلوم ہوا جیسے نواب خان مظفر خان شہید کے دو ہزار جانباز قلعہ کی فصیلوں پر دشمن پر جوابی حملہ کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں شہر پناہ کی فصیل پر اسلامی پرچم لہرا رہا ہے ضعیف العمر نواب زندہ بکتر پہنے گھوڑے پر سوار اپنے بہادر سپہ سالاروں کے ہمراہ خود ہر مورچہ کا معائنہ کرتا پھر رہا ہے کہ اتنے میں دشمن کے توپ خانہ نے گولہ باری شروع کر دی اور ادھر قلعہ کے مورچہ بند جانبازوں نے جوابی حملے شروع کر دیئے۔ گھمسان کا رن پڑ رہا تھا "زمزمہ"[1]

---

[1] "بھنگیوں کی توپ" جو احمد شاہ ابدالی کی یادگار ہے اور آجکل لاہور کی مال روڈ پر نصب ہے۔

توپ کی دل ہلا دینے والی گونج گرج اور دھماکوں سے قلعہ کی دیواریں لرز رہی تھیں، گر رہی تھیں اور نواب کے بہادر سپاہی ہتھیار پھینکنے کے بجائے جامِ شہادت پی رہے تھے اور نعرۂ تکبیر سے آسمان کا گنبد گونج رہا تھا کہ "ہم نا فانا" دشمن قلعہ میں داخل ہو گیا۔ مگر نواب اور اس کے مٹھی بھر سپاہی، ملبے اور دیوار کے کھنڈر کے پیچھے کھڑے ہوئے آخری دم تک لڑتے رہے۔ ان کی زبان پر خدا کا نام تھا اور چہروں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ابھی دشمن بری طرح گولہ باری کر رہا تھا۔ آخر بڑی دیر تک خوں ریز جنگ ہونے کے بعد "قلعہ ملتان کا ہیرو"، نواب مظفر خاں اپنے پانچ بیٹوں اور ایک بہادر بیٹی کے ساتھ لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ وہ تاریخ عالم میں اپنی بہادری، حب الوطنی اور قومی دملی آن بان کی ایک ایسی مثال چھوڑ گیا ہے جسے زمانہ ہمیشہ یاد کر کے خراجِ عقیدت کے پھول چڑھاتا رہے گا۔" میں نے دل میں کہا اور بالاخانہ سے اتر آیا۔

سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ خزاں رسیدہ ماحول میں جیسے بہار کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ صدیوں کے حادثات اور واقعات کی المناک پرچھائیاں کہیں ویرانوں میں کھو گئی تھیں۔ بڑی دیر تک بیسویں صدی کے قلعۂ ملتان میں گھومتے پھرتے وہاں کے چند جدید مقامات، کتب خانہ، جدید طرز کا کھیلوں کا میدان

(اسٹیڈیم) جس میں پچاس ہزار آدمی بیک وقت سما سکتے ہیں تیراکی کا تالاب اور پرانے آثاروں میں قلعہ کا بہت بڑا عالی شان دروازہ دیکھنے کے بعد اس طرف نکل آیا جہاں برطانوی شہنشاہیت کی یادگار "چوکونا مینار" کھڑا تھا۔ (جہاں برطانوی سامراج کے دو شاطر ولیم اینڈرسن اور پیٹرک الگزنڈر انز ایگنیو دفن ہیں) ۱۸۴۸ء میں ولیم اینڈرسن اور ایگنیو کو سکھوں نے سازش کر کے قتل کروا دیا تھا چنانچہ کچھ دنوں کے بعد سکھوں اور انگریزوں میں جنگ ہوئی اور ۱۸۴۹ء میں قلعہ ملتان پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا۔ جان ڈنلپ نے قلعہ پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ حقیقت اجاگر ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"شہر پناہ کی فصیلوں، اور شہر کے شمال کی جانب نگاہ اٹھاتے ہی قلعہ کے اندر حصار بند نہایت بلند گڑھی (چھوٹا قلعہ) ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ۲۱ جنوری کو جب انگریز فوجیں قلعہ میں داخل ہوئیں تو دیوان مولراج یہیں پناہ گزیں تھا۔ یہ گڑھی بہت اونچے ٹیلے پر ہے۔ جس کے چاروں طرف چالیس اور ستر فٹ اونچی اونچی شش پہلو دیواریں حلقہ گیر ہیں۔ شمال مغربی دیوار کوئی دو سو گز لمبی ہے جہاں سے شہر کٹ گیا ہے قلعہ کی بیرونی چٹان فصیل سے ملی ہوئی ایک بیس فٹ گہری اور چالیس فٹ چوڑی کھائی بنی ہوئی ہے اس کے علاوہ فصیل

کے چاروں طرف کوئی تیس برج نما مینار، بالاخانے، حویلیاں، مسجدیں، اور ہندوؤں کا قدیم زمانے کا مندر، اور خان سا محل ہے۔ ان عمارتوں کی خوبصورتی اور طرزِ تعمیر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن ۱۸۱۸ء میں رنجیت سنگھ کی گولہ باری سے یہ عمارتیں برباد ہو چکی ہیں۔ قلعہ بندی کے اعتبار سے ہندوستان میں اس قلعہ کا جواب نہیں ملتا۔ جس کا اعتراف ولیم اینڈرسن نے لاہور ریذیڈنٹ کے نام ایک خط میں کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ ایسا قلعہ ہندوستان بھر میں کہیں نہیں دیکھا جو اتنا محفوظ، مستحکم ہو اور جس کی فصیلوں پر دفاعی مورچہ بندی کے لئے آٹھ توپ خانے بنے ہوئے ہوں اور جہاں زندگی کی تمام ضروریات کا بکثرت ساز و سامان موجود ہو۔"

یہ کوئی صدی قبل کی کہانی ہے یا محض ڈنلپ کی بڑ۔ میں نے چوکونے مینار پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر کہا اور پھر مینار سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا۔ پھر مجھے "بمبئی ٹائمز" کے نامہ نگار اور اور مشہور تاریخ داں کی وہ تاریخی دستاویز بھی یاد آگئی۔ جس نے قلعہ کی تعریف، دولت اور خوبصورتی کے بارے میں لکھتے ہوئے ڈنلپ کو بھی مات کر دیا ہے۔ قلعہ کا آنکھوں دیکھا حال پیش کرتے ہوئے بمبئی ٹائمز کا نامہ نگار لکھتا ہے:۔

"یہ قلعہ کیا ہے دولت اور اشیائے خورد و نوش اور آسائش

کی منڈی ہے۔ جس کے بڑے بڑے گودام اور مال خانے چھتوں تک بھرے پڑے ہیں۔ افیون نمک، گندھک اور معمولی سے معمولی چیزوں سے لے کر چاول گھی گندم، چمڑے کے تھیلے، ہمہ اقسام بہترین عمدہ ریشمی کپڑے، شال، قالین، اسلحہ سے بھرے ہوئے تہہ خانے اور نہ جانے کتنی چیزیں ہیں جن کا شمار کرنے کے لیے مہینوں چاہئیں ان استعمال کی اشیاء کے علاوہ مجھے سب سے زیادہ اس دولت نے محو حیرت کر دیا ہے جس کی تصویر میرا قلم بھی نہیں کھینچ سکتا۔ اور میں حیران و ششدر کھڑا ہوا سونے چاندی، ہیرے جواہرات سے بھری ہوئی سر بمہر اَن گنت دیگوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کثیر دولت کا کوئی ٹھکانہ نہیں جسے دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور میرے حواس میرے قابو میں نہ رہے۔"

جان ڈنلپ "اوز بمبئی ٹائمز" کے نامہ نگار کے آنکھوں دیکھے تاریخی تذکروں کو سوچ کر مجھے بیٹھے بیٹھے ایک جھرجھری سی آئی اور میں متعجب نگاہوں سے قلعہ کے ماحول کو دیکھ کر خود حیران و ششدر تھا کہ وہ قلعۂ ملتان جس کے بارے میں ان مشہور تاریخ دانوں نے اپنے جذبات کو تاریخ میں سمویا ہے کیا یہ حقیقت تھی یا محض کوئی قدرتی جادوگری کا تماشہ تھا جسے دیکھ کر یہ تاریخ داں بہک گئے تھے مجھے جیسے ان پر یقین ہی نہیں آیا کیونکہ نہ وہاں قلعہ کی ان عالی شان یادگاروں کے نقوش اُجاگر تھے اور نہ وہ دولت کی فراوانی تھی

اور نہ چہل پہل۔ کیونکہ جب ۱۹۴۷ء میں انگریز سامراج اور حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو ۶۸۔ ایکڑ رقبہ میں سوائے ویرانوں، ٹیلوں کے گویا کچھ نہ تھا۔ قلعہ کے بچے کھچے کھنڈر سنسان پڑے تھے جہاں شب کو گیدڑوں اور بھیڑیوں کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔

ان تمام باتوں پر تن تنہا سوچ بچار کرنے کے بعد جب میں کمر سیدھی کرتے ہوئے اٹھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے زمانہ کے حادثات نے مجھے بھی قلعہ کی طرح کھوکھلا کر دیا ہو۔ میں نے "چوکونا مینار" پر پھر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر تھکے ماندے مسافر کی طرح چل پڑا۔ قاسمؒ باغ کے معطر ماحول میں قدم رکھتے ہی جیسے میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ چاروں طرف خوب چہل پہل اور گہما گہمی تھی اور جیسے جیسے گلابی فضائیں باغ کے ہرے بھرے ماحول پر چھا رہی تھیں، مستقبل کے زندہ درخشاں لمحات کا سماں میری آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر کسی جنت میں آگیا ہوں۔ جہاں طائران خوش الحان کی نغمہ سرائی سے پتہ پتہ سرشار ہے اور ذرہ ذرہ زندگی کی گوناگوں خوشیوں سے چمک رہا ہے اور

لہ ۱۹۴۹ء میں (قلعہ کے ویران ٹیلوں اور گڑھوں کو ہموار کر کے اس باغ کی بنیاد رکھی گئی)۔

سارا ماحول دیس کی خوش حالی، ترقی اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہا ہے، جن کی مترنم آوازوں میں میرے دل کی دھڑکنیں بھی شامل تھیں۔

جہلم کے اُس پار

جرنیلی سڑک ایک سیاہ اژدہے کی مانند ناہموار زمین اور ٹیلوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتی اور کبھی سیدھی سپاٹ دکھائی دینے لگتی۔ سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت کھڑے تھے، جن کی گہری چھاؤں میں ابدی سکون اور فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ صدیوں پرانی سڑک بوڑھی اور تجربہ کار ماں کی مانند ہی تو تھی جس نے اپنے سینے پر نجانے کتنے سپوتوں کو کھیلتے کودتے دیکھا تھا۔ اسے لشکروں کے پُرعظمت مناظر بھی یاد تھے۔ پشاور سے لے کر کلکتہ تک سینکڑوں پُرکیف و پُرخطر مقامات سے گزرتی چلی گئی ہے اور اس کی عظمت و تاریخی شان و شوکت سے لوگ صدیوں سے واقف ہیں۔ گویا وہ دیس کی شہ رگ ہے جس کی اہمیت اور تاریخی پس منظر میں شیر شاہی دور کی کئی سچی روایات

وابستہ ہیں۔

چلتے چلتے میں اور میرا ملاقاتی کنک خاں جرنیلی سڑک چھوڑ کے بائیں ہاتھ پر ایک پگڈنڈی پر نکل آئے۔ بڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کنک خاں ایک فوجی پنشن یافتہ معمر آدمی تھا۔ جنگ عظیم اور جنگ عالمگیر دونوں لڑائیوں میں اس نے سمندر پار جا کر بہت سے تمغے حاصل کئے تھے۔ جہاں دیدہ اور خوش مزاج ہونے کے سبب سے پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں بے تکلف ہو گئے، چنانچہ مارگلہ[1] کے چشمے سے لوٹ کر ہم بریگیڈیر جنرل جان نکلسن فاتح دہلی کے یادگار مینار کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ اس مقام کے شمال مغرب کی طرف کھیت اور ہری بھری جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے ٹیلے تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ فضا بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ کبھی کبھی گیہوں کی پکی فصل کاٹتے ہوئے کوئی سرو قامت دوشیزہ درانتی ہاتھ میں لئے ہماری طرف دیکھنے لگتی۔ اسے دور سے یوں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی یونانی مجسمہ گیہوں کی سنہری بالیوں کے جھرمٹ میں کھڑا ہے۔ ہم دونوں اس وقت دنیا بھر کے قصے لئے بیٹھے تھے اور پر اسرار مرغزاروں کے بدلتے ہوئے مناظر ہماری نگاہوں میں کھبے جا رہے تھے اب میں نے کھڑے ہو کر مینار کے محراب کو دیکھا جس پر جنرل مذکور کے

---

[1] راولپنڈی سے تھوڑی دور پر ایک پُر فضا مقام ہے۔

کارنامے کندہ تھے۔ لکھا تھا۔

"۱۸۴۰ء اور ۱۸۴۵ء میں سکھوں سے جنگ کی۔ ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۷ء کی لڑائیوں میں شہرت دوام حاصل کی اور دہلی فتح ہونے کے بعد مارا گیا۔"

نکلسن کے یادگار مینار کو دیکھ کر جیسے آپ ہی آپ میرے دل میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ میں ۱۸۵۷ء کی آزادی کا تاریخی المیہ (جسے غیر مورخ "غدر ہند" کے نام سے موسوم کرتے ہیں) میری نگاہوں کے سامنے ایک پرانی تصویر کی مانند گزر گیا۔

اتنے میں کنک خاں بولا۔

"شاہ جی انگریزی میں یہ کیا لکھا ہے؟"

"ایک انگریز جرنیل کے کارنامے لکھے ہیں جس نے سن ستاون کی جنگِ آزادی کے خلاف لڑ کر ہزاروں وطن پرستوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔"

یہ سن کر کنک خاں کے چہرے کا رنگ بدل سا گیا اور بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "ہمیں ان یادگاروں سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ کنک خاں۔ ظلم و تشدد کی ایسی یادگاریں قوم کو غفلت سے چونکنے کے لئے ایک تازیانہ ہیں۔"

پھر میں نے موضوع بدل کے دریافت کیا۔ "تم اس علاقہ کے چپے چپے سے واقف ہو گے؟"

"یہاں بہت سے پر فضا مقامات ہیں، شہر در شہر گھوم پھر کر ہی زندگی کی گہما گہمی کا جو لطف آتا ہے وہ بھلا سواری میں کہاں"

"آپ جہاں چلنا چاہیں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

ہم دونوں اپنی جگہ سے اٹھے اور پھر سڑک پر نکل آئے تھوڑی دیر میں شمال کی جانب سے بادل کا ایک بہت بڑا ٹکڑا فضاؤں میں لہراتا ہوا اٹھا اور ہوا تیزی سے چلنے لگی۔ دو چار منٹ میں سورج بادل کی اوٹ میں چھپ گیا۔ مست خرام ہوا سے درخت جھاڑیاں جھوم رہی تھیں اور کہیں دور سے کوئل کی آواز آ رہی تھی۔ اتنے میں ہمارے اوپر سے ایک نیل کنٹھ شور مچاتا ہوا گزر گیا اور میرے کانوں میں پوربی دوشیزہ کے گیت کے بول لہرانے لگے۔

"کروں کون جتن اے ری، اے ری سکھی مورے نینوں سے برسے بادریا
آئی کالی گھٹا بادل گرجے چلے ٹھنڈی پون مورا جیا ترسے۔"

اس وقت کا منظر ہی کچھ ایسا تھا کہ مجھے یہ گیت بہت بھلا معلوم ہوا۔ جب ہم ایک ٹیلے کے قریب سے گزرے تو ایک نوجوان دیہاتی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھا بڑے مزے میں گا رہا تھا۔ اس کی درد بھری آواز اور لمبی تانیں جیسے میرے دل کی انتہائی گہرائی میں اترتی چلی گئیں۔ میں نے ٹنگ خاں سے کہا:۔

"گیت تو بڑا پیارا معلوم ہوتا ہے۔"

"اسے ماہیا کہتے ہیں۔" ٹنگ خاں بولا۔

"ماہیا"

"جی ہاں۔ پنجابی گیتوں میں ماہیا بہت مشہور گیت ہے۔ مرد عورتیں، لڑکیاں۔ غرضیکہ بچے بچے کو یہ گیت بہت مرغوب ہوتا ہے اس کے ڈیڑھ مصرع میں دل کے جذبات کی کائنات سمائی ہوتی ہے، یوں سمجھ لیجئے جیسے کوزے میں دریا بند کردیا گیا ہو۔"

"خوب۔ خوب۔" میں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ اور پھر باتیں چھیڑ دیں۔

"دیہاتی گیت خواہ کسی علاقے کے کیوں نہ ہوں اور کتنے ہی ناقابلِ فہم اور پیچیدہ کیوں نہ ہوں۔ لیکن مطلب اور معنی کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے کھلی آزاد فضاؤں میں بسنے والے غریب کسانوں اور لوگوں پر جو کچھ گزرتی ہے وہ گیت بن کر ان کی نوکِ زبان پر آجاتی ہے۔ یہی قدرتی شاعری ہے جس میں مناظرِ قدرت سے بے کردکھ سکھ اور پیار اور محبت کی منہ بولتی اور زندہ جاوید تصویریں ملتی ہیں۔ جہاں کہیں ان گیتوں کے شیریں بول کانوں میں پڑتے ہیں سننے والے کا دل مطلب سمجھے بغیر ہی پھڑک اٹھتا ہے۔"

کنک خاں میری لمبی چوڑی تمہید سن کر کچھ سوچنے لگا، پھر اپنی لمبی چھنگلیا میں سگریٹ دبا کر گہرا کش لگا کے بولا۔ "شاہ جی ہمارے علاقے میں آپ جہاں کہیں جائیں گے بڑے چھوٹے سب ہی کو مسکراتا ہوا پائیں گے۔ دن بھر محنت مزدوری، کھیتی باڑی اور بوجھ ڈھوتے

ڈھوتے جہاں ذرا سی مہلت ملی، کسی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر گیتوں سے دل بہلا کے اپنی ساری تھکن بھول جاتے ہیں یہاں کے لوگ اَن پڑھ سہی مگر بڑے مہماں نواز اور دلیر ہوتے ہیں مزاج میں ظرافت بھی خوب ہوتی ہے۔ ہنسی مذاق کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مذاق، ظرافت کبھی کبھار انھیں دست و گریباں تک پہنچا دیتی ہے غرض کہ انتہائی محبت اور دشمنی کے جذبات انھیں غیر انسانی فعل کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ جن کی مثالیں گیتوں میں کہیں کہیں خوب ملتی ہیں۔۔

میں اپنے ملاقاتی کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ بڑی دیر تک گیتوں پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا اور اس سفر کی طویل مسافت کا ذرہ بھر احساس نہ ہوا اور سورج چھپتے چھپتے ہم پنجہ صاحب پہنچے اس مقام کے بارے میں میرا یہ خیال تھا کہ اس کا نام پانچ دریاؤں کی مناسبت سے رکھا گیا ہوگا۔ لیکن کنگ خاں نے اس مقام کے نام کی وجہ جیسے یہاں کے سکھ بیان کیا کرتے تھے سنائی کہ ایک مرتبہ سکھوں کے پیشوا گرونانک ادھر آنکلے اور اس دوران میں انہیں سخت پیاس معلوم ہوئی۔ پانی کی تلاش میں ادھر ادھر آدمی دوڑائے گئے۔ مگر پانی تھا کہ عنقا۔ سب لوگ حیران تھے کہ گروجی کے لئے پانی کہاں تلاش کیا جائے۔ گروجی جہاں مقیم تھے وہاں سے تھوڑی دور پر انہیں ایک پہاڑی نظر آئی جس کی چوٹی پر ایک مکان

دیکھا۔ خیال آیا کہ اس مکان میں ضرور کوئی رہتا ہو گا اور اس کے
پاس پانی بھی ہو گا۔ چنانچہ ایک شخص اس پہاڑی پر پہنچا۔ جب
مکان میں داخل ہوا تو ایک مسلمان درویش بابا قندھاری رہتے تھے
اس شخص نے درویش سے پانی مانگا۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر واپس
کر دیا کہ اگر تمہارے گرو جی کو کمال آتا ہے تو پھر نیچے بیٹھے بیٹھے پانی
کیوں نہ منگوا لیا۔ اس نے واپس آکر اپنے گرو جی سے بابا قندھاری
کا ٹکا سا جواب سنا دیا۔ کہتے ہیں پھر گرو نانک نے اپنی کرامت
دکھائی اور وہ چشمہ جو پہاڑی پر تھا اسے بیٹھے بیٹھے زمین پر کھینچ لیا
اس پر بابا قندھاری بہت بگڑے اور طیش میں آکر انھوں نے اس
پہاڑی کو جس پر چشمہ تھا لڑھکا دیا۔ گرو جی نے جب پہاڑ کو نیچے آتے
دیکھا تو ہاتھ بڑھا کر اُسے روک لیا۔ اس طرح پہاڑ کو روک لینے
سے ان کے پنجے کا نشان بن گیا اور اسی نشان کی مناسبت سے اس
مقام کا نام "پنجہ صاحب" مشہور ہو گیا۔!!"

اس کہانی کو سن کر مجھے حسن ابدال کے مشہور "واہ باغ" اور
"واہ" گاؤں کی روایت یاد آگئی یوں تو کئی تاریخی باغات نظر سے
گزرے مگر "واہ باغ" کا پورا ماحول بڑا دلکش اور رومان پرور
ہے ایک نہایت پُر فضا مقام پر یہ باغ واقع ہے اور اس کے
سامنے چوڑے پاٹ کی ندی بہتی ہے۔ باغ کے بیچ میں ایک بہت
صاف ستھرے پانی کا چشمہ ہے جسے آب رسانی کے کام میں لایا جاتا

ہے۔ اس باغ کو جلال الدین اکبر شہنشاہ ہندوستان نے بنوایا تھا۔ جب وہ کشمیر جاتا تو اسی باغ میں کچھ روز قیام کرتا۔ باغ میں مغلیہ فن تعمیر کی دو یادگار عمارتیں بھی ہیں۔ ایک تو گردشِ روزگار سے کھنڈر میں تبدیل ہو گئی ہے اور دوسری کچھ بہتر حالت میں ہے کہتے ہیں جب واہ باغ بن کر تیار ہوا تو شہنشاہ دیکھنے کے لئے آیا اور اس کی دلکشی کو دیکھ کر بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا۔

"واہ چہ باغ است!"

چنانچہ اسی وقت سے یہ "واہ باغ" ہر خاص و عام میں مشہور ہو گیا۔ اور آبادی کا نام بھی واہ پڑ گیا۔

رات کنگ خاں کے ایک ملاقاتی بگّو خاں کی حویلی میں بسر کی۔ بڑی دیر تک اکتارے پر پنجابی اور مقامی گیت سنے، ہیر وارث شاہ کے شعر سُنے۔ اور خوب گہما گہمی رہی۔ بگّو خاں نے ہماری خاطر مدارات میں بڑی فراخدلی سے کام لیا۔ جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب آدھی رات کو بستر پر لیٹنے کا موقع ملا تو لمحہ بھر میں ہی ایسی نیند آئی کہ دوسرے دن سورج چڑھتے آنکھ کھلی۔ کنگ خاں اور بگّو خاں میرے بیدار ہونے کے جیسے منتظر تھے۔ جیسے ہی میں اٹھا نہانے کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ نہا دھو کر فارغ ہوا تو ناشتہ کیا۔ لسّی، مکھن سے چپڑی ہوئی اور مہکتی ہوئی روٹیاں، ساگ اور اُبلے

ہوئے انڈے کھا پی کر جیسے میرے ہاتھ پیروں میں بلا کی چستی آگئی تھی اب ہم پنجہ صاحب کا گوردوارہ دیکھنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں سکھوں کی مقدس عبادت گاہ دوسری تاریخی یادگاروں کی طرح ویران اور خاموش تھی۔ اس کے پاس ہی ایک چشمہ دیکھنے میں آیا۔ جس کی صاف اور شفاف سطح آب پہ سنہری دھوپ نے چاندی کا پانی پھیر دیا تھا۔ تہہ کی ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ نیچے کے پتھر الماس کی مانند جھل مل جھل مل کر رہے تھے۔ ہاتھ ہاتھ بھر کی سیاہ رنگ کی مچھلیاں اپنے گلپھڑے، پنکھ ہلاتی ہوئی سطح آب پر آکر رک جاتیں اور منہ کھولے ہوئے ہمیں بڑے غور سے دیکھنے لگتیں۔ جیسے ماضی کے درد بھرے افسانے سنانا چاہتی ہیں۔ ان کی موتی جیسی آبدار آنکھوں سے مایوسی اور دکھ کا اظہار ہو رہا ہے، لمبی مونچھیں اور دونوں بازو ہلا ہلا کر شاید اپنی ناکام جدوجہد کے بارے میں کچھ بیان کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ یہ غریب مچھلیاں ہمارے پاس اپنی رہائی اور آزادی کی درخواست لے کر آئی ہیں۔ شاید صدیوں کے پرانے اور روائتی چشمے کی قید و بند سے اکتا گئی تھیں اور یہ چاہتی تھیں کہ ہماری طرح وہ بھی آزاد ہو جائیں اور کھلے آزاد پانیوں میں اچھلیں، کودیں اور رقص کریں۔ یہ سوچکر مجھے ان غریب مچھلیوں پر بڑا رحم آیا۔ اتنے میں کنگ خاں نے تھوڑے سے مرمرے اور بھنے ہوئے

چنے ان کے سامنے پانی میں ڈال دیئے اور وہ سب بھوک کے مارے دوڑتی ہوئی نیچے تہہ کی طرف چلی گئیں۔ آخر ٹہلتے ہوئے ہم دونوں گوردوارہ کے اندر جانے کے خیال سے بڑے دروازے کی طرف نکل آئے۔ لیکن وہاں سنگینوں کا پہرہ تھا اس لئے واپس آ گئے۔

دوسرے دن صبح ہم پنجہ صاحب سے ٹیکسلا روانہ ہو گئے دوپہر سے پہلے ہی وہاں قیام کیا اور کھانے کے بعد اصل مقام سے کوئی چار میل اور مسافت طے کر کے عجائب خانہ پہنچے۔ کئی چیزیں دیکھنے میں آئیں، چوڑیاں، کنگھیاں، موسل، موتی کی مالائیں، چکیاں، صراحیاں سونے چاندی کے برتن، جنگی ہتھیار اور بہت سی روزمرہ کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ جن سے قدیم ہند و تہذیب و معاشرت کا پتہ چلتا تھا۔ کنگ خاں نے ان تمام چیزوں کو دیکھ کر مجھ سے دریافت کیا:-

"شاہ جی یہ تو میں نے بھی سنا ہے کہ اصل شہر ابھی تک زمین میں دفن ہے۔ مگر یہ تباہ کیسے ہوا تھا؟"

"اس کے متعلق مجھے بھی نہیں معلوم" میں نے جواب دیا۔

پھر عجائب خانے سے باتیں کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔ میں نے کنگ خاں کے کندھے کا سہارا لے کر کہا۔

"اس شہر کی تاریخی کہانی بڑی طویل ہے۔ جب سکندر نے

مغربی پاکستان کے اس علاقے پر حملہ کیا تو اس وقت یہاں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جن میں دریائے سندھ اور جہلم کے درمیانی علاقے پر راجہ امبی حکمراں تھا اور ٹیکسلا اس کی راجدھانی تھی، جب سکندر واپس چلا گیا تو پھر یہاں کئی حکومتیں قائم ہوئیں ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ ٹیکسلا قدیم علم و ادب کا مرکز بن گیا ہر مکتبۂ فکر کے طالب علم دور دراز سے آکر یہاں فیضیاب ہوتے تھے اس شہر کی رونق اور خوبصورتی کے بارے میں قدیم تاریخ میں بہت سے حوالے ملتے ہیں لیکن اب شہر کی جگہ اس چٹیل میدان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ تمام تاریخی کہانیاں فرضی داستانیں ہیں۔" میں نے سپاٹ میدان کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ اور باتیں کرتا ہوا کنگ خاں کو لے کر اس پہاڑی پر پہنچ گیا۔ جہاں شہر کے کچھ آثار نکالے گئے تھے۔ جامعہ (یونیورسٹی) کی دو دو گز اونچی دیواروں کو دیکھ کر اس کے محل وقوع کا اندازہ لگانا بہت آسان تھا۔ اس کے علاوہ عبادت گاہیں، دیوتاؤں کے مجسمے، محرابی دروازے اور کئی قبریں دیکھنے میں آئیں۔ اس زمانے کا رواج تھا کہ مُردوں کو جلا کر ان کی خاک دفن کر دی جاتی تھی۔

"کافی دلچسپ شہر معلوم ہوتا ہے۔ نہ معلوم ابھی اور کتنی ایسی عمارتیں ہوں گی جو زیر زمیں مٹ چکی ہوں گی۔ مگر اس کی دریافت کا کام کس نے کیا ہے؟"

" انگریزوں کے زمانے میں اس شہر کے آثار نکالے گئے تھے اور یہ کام ایک مشہور انگریز سر جان مارشل کی نگرانی میں انجام پایا۔"

کنگ خاں بڑی دلچسپی سے مصروف گفتگو تھا اور ہم دونوں پہاڑ کے دامن سے ہوتے ہوئے اسٹیشن کی سرائے کی طرف نکل آئے۔ شام کے دھندلکوں میں ہر چیز چھپ گئی تھی۔ سورج ڈوبتے ہی، تاریکی چھا گئی۔ پرانے آثار اور یادگاروں پر جیسے الّو بولنے لگا سرائے کے طرف عجب ہُو کا عالم اور سناٹا تھا۔ چند مقامی لوگ آپس میں سرائے کے باہر دکان پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے لب و لہجے اور گفتگو سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے پنجابی بولی پشتو بولی سے گلے مل رہی ہے۔

وادیٔ گلگت

بے برگ و بار چٹیل پہاڑوں کی تنگ وادی میں چھوٹا سا شہر یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی ننھا منّا بچہ پنگوڑے میں پڑا کھیل رہا ہے۔ پتھر کے تنگ و تاریک مکانات، چند گلیاں اور ایک بڑا بازار اور تنگ گلی مسجدوں میں لڑکوں کے پڑھنے کی آوازیں صبح ہی صبح طلوعِ آفتاب کے بعد گونجنے لگتی ہیں شہر کے دائیں بازو پر تیز رفتار ندی چاندی کا لہریا بناتی، سائیں سائیں کرتی بہہ رہی تھی وادی کے چاروں طرف چھوٹے بڑے نالوں کا جال بچھا ہوا تھا لیکن گلگت ندی کا الھڑپن، اس کے شاداب کنارے، جنگلی گھاس پر پھدکتے ہوئے بھوری بھوری ٹڈیاں، بھیڑوں اور پہاڑی گلّے کے چرنے کا منظر، چرواہوں کی کشتی، نوجوانوں کا کان پر ہاتھ رکھ کر کسی کی یاد میں لمبی تانیں لگانا - ایک عجیب

سماں باندھے ہوئے تھا۔ ان کی گول گرم ٹوپیاں، چرمی اور گرم واسکٹ، لبادہ اور چوڑی چکلی شلواریں، کسی جانور کی کھال کی بنی ہوئی چپلیں ان کے دراز قد اور توانا جسم پر خوب کھپ رہی تھیں لیکن ان لوگوں میں چند زیادہ ایسے تھے جن کی قبائیں تار تار تھیں جن کی واسکٹوں میں سوراخ ہو گئے تھے اور ان کے پھٹے پرانے کپڑوں سے یاس، افلاس کی پرچھائیاں صاف عیاں تھیں ان کے کشادہ سینوں کو دیکھ کر جرأت، ہمت، محبت اور انسانی خیرسگالی کا جذبہ صاف عیاں ہو رہا تھا۔

سنگلاخ پہاڑوں اور ندی کو ان کے دُکھے دِلوں کی بپتا خوب یاد تھی ندی کی متلاطم موجیں جیسے ان کی افلاس زدہ کہانی پر سینہ کوبی کر رہی تھیں اور غم کا مارا غریب کمہار اپنے خچر کو ہنکاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ شیناؔ[1] کے میٹھے بولوں میں اضطراب، تڑپ، مٹھاس اور تلخی میں ایک عجیب کھچاؤ تھا کہ دل آپ ہی آپ اس کے دکھ بھرے گیت سے بھر آیا۔

قدرت کے اس کوہستانی علاقہ کے انسانوں کی زندگی دیکھ کر دل پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ زندگی بلند و بالا پہاڑوں کی گھاٹیوں اور پرخطر ندی نالوں میں اس طرح خاموش پڑی تھی جیسے وہاں انسانوں

---

[1] مقامی زبان

کی گزر نہیں جیسے ڈیڑھ لاکھ انسان ، دُنیا اور پاکستان کے باقی علاقوں سے بالکل بیگانہ ہیں جیسے ان لوگوں کا شمار دنیا کی آبادی میں نہیں ہوتا۔ غرضیکہ ان کی معصومانہ اور مفلس زندگی اور جہالت نے انھیں اپنوں سے بہت دور کر رکھا ہے۔ ان کی بھولی بھالی اور سیدھی سادی زندگی میں جہاں زندگی کے دکھوں کا احساس ہوتا ہے وہاں خوشیوں سے دمکتے ہوئے چہرے بھی نظر آتے ہیں ــ ــ

ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ

ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ

ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ دن بھر کی سخت محنت اور مشقت کے بعد جب شام کو گھر لوٹتے ہیں تو مٹی کا تیل بھی میسّر نہیں ہوتا۔ مٹی کے تیل کی قیمت کسی خوشبودار تیل سے کم نہیں ہے چربی اور دیگر روغن سے دیئے ٹمٹماتے ہیں اور کہیں تو صرف آگ کی مدھم سی روشنی سے کام چلا لیا جاتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی قلّت ہونے کی وجہ سے لوگ عموماً مکئی اور جانوروں کے شکار کر کے پیٹ بھرتے ہیں۔ سیب اور اخروٹ پر بھی گزراوقات ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ پانی کے شیریں دھارے صدیوں سے اس بنجر پہاڑی سرزمین کو سیراب کرتے چلے آرہے ہیں، آب و ہوا کی خوشگواری حیرت انگیز پہاڑ موسم گرما کا خوشگوار ماحول ہونے کے باوجود یہاں زندگی کی رمق نہیں معلوم ہوتی۔ کڑاکے کی سردی

میں تو پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا۔ لیکن گلگت کے شیریں فرہاد موسم کی تلخیوں کے باوجود اپنی روزی کمانے کے لئے خچر، کدال اور جانور لے کر نکل پڑتے ہیں۔

میں اور زاغلو خاں ترکمان بڑی دیر تک ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے اشاروں کنایوں میں باتیں کرتے رہے زاغلوں کی شینا میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بہر کیف بہت سی باتیں ادھوری رہیں۔ نہ تو مجھے کوئی مقامی گیت مل سکا اور نہ ہی کوئی ایسا آدمی جو مجھے ان شیریں گیتوں کا مفہوم بتا سکتا غرض کہ زاغلو کی صحبت پھر بھی بڑی دلچسپ رہی اس کی آنکھوں میں محبت کی چمک تھی اس کا جسم بڑا پھرتیلا تھا۔ اس کے سڈول بازو، چوڑا چکلا سینہ اس کے کھردرے ہاتھ پاؤں، مضبوط پٹھے، سرخ و سفید کتابی چہرہ کھڑے کھڑے ناک نقشے بڑے دلکش تھے۔ گو جسامت کے اعتبار سے بڑا پرخوف معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن چہرے سے متانت، خلوص محبت کا جذبہ عیاں تھا۔ مگر جس طرح وہاں کے چار ہزار فٹ بلند پہاڑی چٹانیں دشوار گزار تھیں اسی طرح میرے لئے اس کی شینا زبان بھی اتنی ہی مشکل تھی۔ بڑی دیر یونہی ندی کا منظر دیکھتے رہے کبھی کبھار کوئی پہاڑی کوا، کوئی اجنبی پنچھی شور مچاتا ہوا ہمارے سروں پر سے گزر جاتا۔

اس وقت خاموش ماحول میں میرے دل میں طرح طرح کے خیالات

پیدا ہو رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس وادی کے ڈیڑھ لاکھ انسانوں سے قومی رشتہ جوڑنے کے لئے جب تک کوئی رسل و رسائل کا انتظام نہ ہوگا وہ آزاد پاکستان کے کروڑوں انسانوں کے ساتھ کیسے برادرانہ تعلقات پیدا کر سکتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ پاکستان کے باشندے نہیں صرف اس وادی کے۔ کوئی ایسی شاہراہ نہیں جس کے ذریعہ براہ راست یہاں آمد و رفت قائم ہو جائے۔ ہوائی جہاز سے صرف بڑے لوگ تفریح و تفنّن کے لئے آتے ہیں بھلا یہ غریب ہوائی جہاز میں بیٹھ کر جانے سے رہے اسی قسم کے بہت سے خیالات آئے۔ پھر میں نے سوچا یہ کام میرا نہیں کہ میں اس پر اپنی رائے زنی کروں یہ سوچکر میں نے زاغلو کو چلنے کا اشارہ کیا۔

کچھ یادیں
کچھ افسانے

ہماری بادبانی کشتی کا بدھی ملاح جوان تھا۔ اس کا گٹھا ہوا جسم، بوٹا سا قد، گول گول سڈول بازو اور پنڈلیاں، گندمی رنگ اور چہرہ کے تبتی، برمی خدوخال اور سیاہ چمکیلی آنکھیں بڑی پُر کشش اور جادو بھری تھیں وہ چٹگام کے صحت افزا مقام کاکس بازار سے کوئی دس میل دور راموگاؤں کا رہنے والا تھا۔ چٹگام کاکس بازار، رانگامتی اور راموگاؤں، ایک حسین اور نہایت شاداب سرزمین کے چار نام ہوں یا کئی ایک لیکن وہاں کی گوناگوں قدرتی خوبصورتیاں اور نشہ آور نظاروں میں زندگی کی ساری لطافتیں اس طرح گھل مل گئی ہیں جیسے سورج کی کرنوں میں قوس قزح کے ساتوں رنگ۔

کاکس بازار چٹگام کے جنوب میں ساحلِ سمندر پر واقع ہے جیسے چٹگام - جہاں پام کے لمبے لمبے سائے نشیلی مست خرام سمندری ہوائیں، پُرسکون نیلگوں سمندر ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے زمین پر آسمان اتر آیا ہو - ستر میل طول طویل ساحل پر جگہ جگہ ارغوانی پھولوں کی جھاڑیاں بدرموگنا کے مقام تک پھیلی ہوئی ہیں - اسی گل پوشش ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے بدھی لوگوں کے گاؤں ہیں - جہاں ان کے پگوڈا طرز کے مکانات ہیں - بانس اور چٹائیوں کے صاف ستھرے مکان، جن کا فرش بھی بانس کا ہوتا ہے اور جس پر قدم رکھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی ٹھنڈے اور ملائم فرش پر چل پھر رہے ہوں - سونے کے لئے پٹ سن کی چٹائیاں، حسب ضرورت سامان اور سیدھی سادی زندگی جس میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ تک معلوم نہیں ہوتا - ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور دوسرے گاؤں سے تیسرے گاؤں اور اسی طرح گاؤں در گاؤں کے روح پرور مناظر دیکھنے کے لئے جیپ گاڑیوں میں ریتیلے ساحل پر بآسانی سفر کر سکتے ہیں جو سیاحوں اور دور دراز سے آئے ہوئے لوگوں کو کرائے پر مل جاتی ہیں - پھر زندگی کی دوسری تفریحات اور ساحل کی فرحت بخش رنگینیوں کا لطف اٹھانا ہو تو تفریحی جھونپڑے اور حکومت کا مہمان خانہ بھی موجود ہے جہاں سجے سجائے گھر جیسے آرائشی کمرے

پانچ روپئے یومیہ کرائے پر مل جاتے ہیں۔ شکاریوں کے لئے سبز پوش پہاڑیوں کے لئے گھنے جنگلات میں شکار گاہیں بھی ہیں۔ ہمہ اقسام چرند و پرند اور حیوانات کی ایک دنیا آباد ہے بارہ سنگھا تیندوا ہاتھی، خرگوش خوبصورت مور ہرے ہرے طوطے، چہکتی گاتی چڑیاں اور طرح طرح کے خوبصورت جانور اور پرندے آہٹ پاتے ہی سرسراتے ہوئے نکل پڑتے ہیں۔ غرضیکہ چڈگام اور چڈگام کے نواحی علاقوں اور سبز پوش پہاڑوں کے گھنے جنگلوں اور شاداب وادیوں، مترنم ندیوں اور پرسکون جھیلوں اور رواں دواں چشموں اور اس کے گرد ونواح میں خواہ کا کس بازار ہو یا کوئی اور مقام یہی گہما گہمی اور زندگی کی بہتی ہوئی ترنگیں جا بجا اور قدم قدم پر دل و نگاہ کو صانع قدرت کی جلوہ سامانی سے ایک لازوال مسرت اور طمانیت بخشتی ہیں۔

ہمارا ایدھی ملاح "مہادیو" نے بھی ایک نہایت خوبصورت مقام میں جنم لیا تھا۔ راموگاؤں جہاں بدھ مہاتما کا ایک بہت بڑا مندر ہے جس کے در و دیوار میں سونے، مرمریں پتھروں اور طرح طرح کی دھاتو کے بنے ہوئے نہائت خوبصورت مجسمے رکھے ہوئے ہیں۔ اس مندر میں رات دن چہل پہل رہتی ہے۔ پجاریوں اور مذہبی رہنماؤں کا جم غفیر لگا رہتا ہے یہ گاؤں جھیلوں سے گھرا ہوا ہے جن میں کنول کے ہزاروں پھول کھلے رہتے ہیں اور قریب ہی سے دریائے کرنافلی گذرتا ہے اس علاقے میں سرشام ہی سے گشتی گویئے گاتے بجاتے

نکل پڑتے ہیں۔ عورتیں، بھولی بھالی لڑکیاں سرخ سارنگ بلاؤز پہنے ماتھے پر بندیا لگائے اپنے سیاہ بالوں کے جوڑوں میں پھولوں کے ہار کھونسے متوالی چال سے حسن و شباب کی رعنائیاں چھلکاتی ہوئی اس طرح نظر آتی ہیں جیسے سبزہ زار میں بے شمار تتلیوں کی بارات نکل آئی ہے لیکن رقص کرتی ہوئی دوشیزائیں اپنے مدھ بھرے گیتوں سے لوگوں کے دلوں کو برماتی ہیں تو کہیں سریلے سازوں کی نہایت دل گداز صدائیں سنائی دیتی ہیں۔

کاکس بازار اور اس کے قرب و جوار میں بدھی اور قنوطی نہدوؤں کی اکثریت ہے۔ زندگی کے دوسرے کاموں کے علاوہ گانا بجانا اور رقص و موسیقی بھی جیسے ان کی روزانہ زندگی کا نہایت ضروری مشغلہ ہے۔ ان لوگوں میں کچھ تجارت پیشہ، سگار بنانے والے مزدور، چابکدست درزی بھی ہیں لیکن بڑی آبادی مچھیروں اور ملاحوں کی ہے۔ مچھلی چاول اور کیلا ان کی عام غذا ہے جو بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ سیر و تفریح کے موقعوں پر کھلے میدانوں اور لب دریا یا جھیلوں کے کنارے تازہ مچھلی کی دعوتیں ہوتی ہیں۔ یہی کیفیت میلوں اور ہاٹ بازاروں کا ہے لوگ عموماً بڑے زندہ دل، ملنسار مہماں نواز اور ہنس مکھ ہوتے ہیں۔

ہمارا ملاح بھی بڑا ہنس مکھ اور زندہ دل تھا۔ اس کا سلسلۂ نسب مشرقی پاکستان کے دوسرے بڑے قبیلہ ماگھ سے ملتا تھا۔

(قبیلہ ماگھ جس کے تین بڑے فرقے ہیں جو میا ماگھ (کاشتکار)
راکھینگ ماگھ اور بردا ماگھ۔ اس کے اجداد بردا ماگھ سے تعلق
رکھتے تھے جو اٹھارویں صدی عیسوی میں اراکان سے بھاگ آئے
تھے وہ انہیں کی نسل سے تھا یعنی اس کی رگوں میں "تبتی۔ برمی" بہادروں
کے خون کے ساتھ ساتھ بنگال کی جادو گر فضاؤں اور رسیلے گیتوں
کی طرب انگیز دودھ کی دھاریں بھی دوڑ رہی تھیں۔ تین چار قوموں کے
باہمی اختلاط سے ہمارے ملاح کے اجداد نے ایک علیحدہ قومیت
اور بود و باش اختیار کئے زمانہ ہو گیا تھا۔ لیکن اسے اپنے اجداد
کی تاریخ یاد نہ تھی۔ اب وہ خالص پاکستانی تھا اور دریائے کرنافلی
کی آب راہوں پر کشتی بانی کرتے کرتے بڑا ہوشیار ملاح بن گیا
تھا۔ نیلی تہمد اور سفید بنیان پہنے کھڑا ہوا کشتی کے بادبانوں کو
کبھی ہوا کے رخ اور کبھی مخالف سمت کرتے وقت اس نے مجھے
کئی بار مسکرا کے دیکھا جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو
لیکن اس وقت میرا پورا دھیان کرنافلی کے وسیع اور شاداب
کناروں کے مناظر میں بٹا ہوا تھا اور نگاہوں کے سامنے جیسے
اس خطۂ سبز پوش کا ایک ایک گوشہ پھر سے اجاگر ہو گیا تھا
چندر[1] ناتھ پہاڑ کی گیارہ سو پندرہ فٹ بلندی پر سے جب

---

[1] چٹاگام کا سب سے اونچا پہاڑ (اراکان اور برما کے سلسلہ کوہستان لشائی کی ایک شاخ)

میں نے اس حسین اور گلپوش سرزمین کا نظارہ کیا تھا تو اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں جنت کے کسی بہت بلند مقام پر کھڑا ہوں دور بلندیوں سے آئینہ کی مانند جھلمل کرتی جھیلیں رواں دواں ندیاں ، کنج ، کیلے ، ناریل اور پھلوں پھولوں سے لدے پھندے درختوں کے جھنڈ ، دھان کے کھیتوں کے ہرے بھرے جزیرے اور ساحلِ سمندر سے ملی ہوئی چٹگام کی بندرگاہ اور شہر یوں نظر آیا جیسے کوئی حسینہ سبزپوش جہاز کے عرشے پر اپنے دونوں خوبصورت بازو تانے کھڑی مسکرا رہی ہے جس کی مٹھیوں میں کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کے خزانے بند پڑے ہیں۔ دوسری سمت سیتاکنڈ[۲۲] کے قریب تون[۲۳] گنگا پہاڑ کے رتیلے اور بھورے پتھروں کا کوئی ایک ہزار فٹ بلند کوہسار تھا جس کے دامن سے لے کر بلندی تک سرخ پھولوں کی جھاڑیاں ہی جھاڑیاں بہار دکھا رہی ہیں۔ کتنا حیات آفریں سماں تھا جس کے تصور سے بیٹھے بیٹھے پھر میں جنت کے کسی گوشے میں پہنچ گیا تھا اور بڑی دیر تک کرنافلی کے شاداب کناروں کے پُراسرار نظاروں میں کھویا ہوا نجانے کہاں پہنچ گیا ——. جیسے میری نگاہیں کسی رُخِ لالہ فام کی تلاش میں سرگرداں ہوں میرے دل کی کیفیت کا عالم کسی چکئی (سرخاب کی مادہ) کی بیقراری سے

---

۲۲ وہ مقام جہاں دریائے فینی آملتا ہے ۲۳ چٹگام کا دوسرا پہاڑ۔

کم نہ تھا جو اپنے پیارے محبوب (چکور) کی راہ تک رہی ہو۔چکئی اور چکور کا خیال آتے ہی مجھے صدیوں پرانی ہندو دیومالا کی ایک کہانی[1] یاد آگئی۔ جمنا کے کنارے چندن کے ایک گھنے پیڑ کی ڈال پر رانی رکمنی جھولا ڈالے جھول رہی تھی کہ اچانک اس کے گلے کا موتیوں کا ہار ٹوٹ کر دریا کے پانی میں گر گیا۔ قریب ہی ایک چکئی بھی تھی۔ رانی بولی۔" اے چکئی جلد دوڑ کر آؤ اور میرے ہار کے موتی پانی کے اندر سے چن کر نکال لاؤ۔"

لیکن چکئی جو پہلے ہی سے اپنے محبوب کے انتظار میں مغموم اور بھری بیٹھی تھی جل کر بولی۔

"تمہارے ہار کو آگ لگے۔ موتیوں پر بجلی گرے شام سے میرا چکور لاپتہ ہے۔ آنکھیں اسے تلاش کر رہی ہیں۔ دل اس کی جدائی میں رو رہا ہے مجھے اتنی فرصت کہاں کہ تیرے ہار کے موتی چنوں۔"

"مگر میرے دل کے ہار کے موتی تو ان حسین وادیوں اور شادابیوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ کرنا فلی کے گہرے پانی میں تو نہیں گرے جن کا مجھے ملال ہو۔" میں نے اپنے دل سے کہا۔ اور اتنے میں جہاندیدہ میرے ملاح نے ایک نہایت پیارا پیارا گیت چھیڑ دیا اس کی پرسوز اور رسیلی آواز سن کر مجھ پر ایک بیخودی کی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ بڑی محویت کے ساتھ بادبانوں کی رسی پکڑے گا رہا تھا

[1] یہ ایک پوربی منظوم کہانی ہے جسے آج بھی برصغیر ہند کے پوربی دیس میں عورتیں گاتی ہیں۔

ایک گاؤں یہاں، ایک گاؤں وہاں۔
بیچ میں لمبا کھیت۔
کھیت کیا ہے صحیفۂ قدرت کا ایک صفحہ۔
جس پر دھان کے ہریالے پودوں سے گل کاری کی گئی ہے۔

اس کے درمیان جھیل ہے۔
جس کا پانی جھلمل کر رہا ہے۔
اس کے سینے پر۔
کنول کے ہزاروں پھول کھلے ہیں۔
اور جھیل کا پانی اس طرح چمک رہا ہے۔
جیسے کسی دوشیزہ کے ماتھے کی بندیا۔!!

(ترجمہ ایک بنگالی گیت جسیم الدین)

جب ملاح گیت ختم کر چکا تو اس نے پھر مجھے مڑ کے دیکھا اور میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

"واہ واہ! تم کتنا اچھا گاتے ہو۔ گیت بھی بڑا پیارا تھا۔"

یہ سنا تو مہا ویرہ مسکرا کر بولا۔ "ایسے نجانے کتنے گیت ہیں۔ ابھی آپ نے سنے کہاں۔"

"تو پھر ایک اور سہی۔" میں نے جواب دیا اور پھر خود ہی اس کے پاس آ بیٹھا۔ مہا ویرہ جیسے میرے مخاطب ہونے کا منتظر ہی تھا

اس نے بیڑی کا ایک دم لگا کر پھر گانا شروع کر دیا۔ ہماری کشتی دریا کے کنارے کنارے چلی جارہی تھی۔ سنہری دھوپ سے جیسے ہر چیز کا حسن اور دوبالا ہو گیا تھا۔ میں چند لمحے ملاح کے گیت سے محظوظ ہوتا رہا اور اس نے گیت ختم کرتے ہی ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ یہاں بیرو بولا۔

" چٹگام بارہ رشیوں کی سرزمین ہے اور انہیں بارہ بزرگوں کی برکت سے ان سبزہ زاروں کو ابدی زندگی نصیب ہوئی ہے یہاں کا ہر آدمی خواہ امیر ہو یا غریب سب ہی ان کے اطاعت گزار ہیں ہمارے ہرے بھرے کھیت، گاؤں، کھلیان دریا یہ تمام چیزیں ہماری ملکیت ہیں اور ان سے انسان اپنے دل میں ایک شکتی ایک قوت ایک ترنگ اور محبت کی مسرتیں حاصل کرتا ہے۔ ہماری پیاری زمین مشرقی پاکستان! جہاں قدرت کے خزانے نبد پڑے ہیں یہاں بڑے بڑے ادیبوں، کلاکاروں، شاعروں اور دانشوروں نے جنم لیا ہے۔"

میں نے اپنے ملاح کا شانہ تھپکتے ہوئے جواب دیا، معلوم ہوتا ہے تم کچھ پڑھے لکھے بھی ہو۔"

" جی ہاں ایسا ہی تھوڑا بہت نبگلا، انگلش لکھ پڑھ لیتا ہوں۔"

" تو پھر چھوڑ کیوں دیا۔"؟

"جب میری منگیتر بڑی ہو گئی تو میرا دل پڑھنے لکھنے سے اُچاٹ ہو گیا جب سے کشتی بانی کرتا ہوں۔ میرا دل گھر پر لگتا ہی نہیں۔ اسی طرح دل بہلا لیتا ہوں۔" مہادیو نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ پھر خود ہی جیسے اپنی کمزوری کو چھپاتے ہوئے بولا۔ "یہ پیشہ بڑا اچھا ہے۔ دور دور کی سیر ہو جاتی ہے اور اچھی خاصی آمدنی بھی۔ پھر آپ جیسے پردیسی لوگوں کی خدمت کا موقع بھی مل جاتا ہے۔"

"خوب!"

پھر میں خاموش ہو گیا اور مہادیو بھی۔ اب ہم کافی دور نکل آئے تھے۔ ہمارے آگے پیچھے اور بھی تفریحی اور دُخانی جہاز آ جا رہے تھے اور قدرتی مناظر کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں قدیم چٹگام اور وہاں کے لوگوں کی تاریخ کھلی ہوئی تھی۔ صدیوں پہلے یہ سارا علاقہ بڑا غیر آباد تھا۔ صرف ایک چٹگام تھا جو مچھیروں اور ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس مقام کو ایک بین الاقوامی بندرگاہ کی اہمیت حاصل ہو گئی۔ اہل فارس، عرب، پرتگالی اور چینی سیاح اور تاجر تو اسے ایک شاندار بندرگاہ کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

مشرق بعید اور یورپ کے جہاز جب یہاں سے گزرتے

تو کئی کئی روز اس بندرگاہ میں لنگر انداز رہتے ہیں اور بیرونی اشیاء کے بدلے مقامی چیزیں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اس تجارتی بیوپار کی وجہ سے بہت جلد چٹاگام ایک بڑی تجارتی منڈی اور بندرگاہ مشہور ہو گیا۔ خصوصاً چینیوں کو یہ بندرگاہ بہت پسند آئی اور انھوں نے اسے بہت ترقی دی۔ اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ چینی شاعروں نے اس کی قدرتی دلکشی پر کتابیں لکھیں چین کا مشہور شاعر (HSUAN TASNG) ہوان ژان نے اس بندرگاہ کی تعریف انی ایک نظم میں ایک "حسن خوابیدہ" سے کی ہے جو پانی اور گہر کے پردوں سے نمودار ہوتا ہے قائداعظم محمد علی جناح کو بھی اس شہر سے بڑی محبت تھی۔ اس کی شادابی سے متاثر ہو کر انھوں نے فرمایا تھا کہ چٹاگام قدرت کے خزانوں کا مقام ہے جس کا مستقبل نہایت شاندار ہے اور وہ دن دور نہیں جب ان کی یہ پیشں گوئی شرمندۂ تعبیر نہ رہے گی۔ یہ سوچ کر جیسے میری نگاہوں کے سامنے شہر کی تصویر فلم کی طرح گزر گئی۔

قدیم شہر کی عمارتوں میں جامع مسجد جو تیس فٹ بلند ٹیلے پر واقع ہے آج بھی شجاع کے جرنیل کی یاد دلاتی ہے اس کے علاوہ پرتگالیوں اور مغلوں کے عہد کا قلعہ، اسلامیہ انٹر کالج (جسے پرتگالیوں نے تعمیر کیا تھا) عظمت کہنہ کی نہایت شاندار عمارتیں

ہیں۔ کورٹ کی عمارت لب دریا ہے جہاں سے کرنافلی کا نظارہ دیکھنے کے قابل ہے اس کے ساتھ ہی چمبک (CHIM BUK RANGE) کے نیلے دھند آلود حصار سے سمندر کی ٹکراتی ہوئی لہروں کا مترنم شور کچھ اور ہی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ان قدیم عمارتوں اور قابلِ دید مقامات میں حضرت بایزید بسطامیؒ کا روضہ بھی ہے جو شہر سے کوئی آٹھ میل دور واقع ہے وہاں بارہ مہینے مریدوں اور زائرین کا میلہ لگا رہتا ہے۔ ادھر ٹیلیگراف ہِل کے چشموں کے پانی کی برکت دیکھئے کہ جس سے سینکڑوں امراض کا علاج ہوتا ہے اور لوگ ہیں کہ دور دراز سے اِن چشموں سے فیضیاب ہونے آتے ہیں۔ قدرت کے اِن شفایاب دھاروں میں نہ جانے قدرت نے کون سا امرت گھول دیا ہے جس کا آج تک بڑے سے بڑا سائنسداں پتہ نہ لگا سکا۔ ادھر اہلِ ہنود بھی شیوا کے متبرک مندر کی جاترا کے لئے برصغیر ہند و پاک کے دور دراز علاقوں سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ اس طرح چٹاگام زیارت گاہوں کا بھی ایک بہت اہم مرکز ہے یہاں ہر رنگ و مذہب کا آدمی نظر آتا ہے، اس کے تنگ گلی کوچوں، چھوٹے بازاروں میں ہر وقت چہل پہل رہتی ہے اور بندرگاہ سے اترتے ہی شہر شروع ہو جاتا ہے جہاں قدیم عمارتوں کے پہلو بہ پہلو، اب بیشمار جدید طرز کی عمارتیں، اسکول کالج اور شفاخانے، کیڈٹ کالج، بنگلے اور مکانات بھی ہیں جو زندگی کی گوناگوں آرائشوں، چہلوں اور سیں

قہقہوں میں آباد ہیں۔

میں ابھی انہیں خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ ماویرو نے کشتی گھاٹ سے لگا کر کہا۔

"اب آپ تھوڑی دیر گھاٹ کی سیر کر لیجئے۔ یہاں آپ کو دوپہر کا کھانا بھی مل جائے گا۔"

"اور تم؟"

"اور میں بھی تھوڑی دیر آرام کر لوں گا۔" اس نے جواب دیا۔

"مگر میں تنہا جا کر کیا کروں گا۔"

"کشتی اکیلی رہے گی۔ ورنہ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا۔"

"تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ یہیں بیٹھا رہوں گا۔ دوپہر کا کھانا منگوا لیتا ہوں۔" میں نے کہا اور ماویرو کو دس روپے تھما کر بولا۔

"یہ لو اور جو تمہیں پسند ہو لے آؤ۔ ہم دونوں یہیں بیٹھ کر کھائیں گے۔ اور پھر تھوڑی دیر آرام بھی کریں گے۔"

ماویرو جواب دیئے بغیر نوٹ لے کر کشتی سے اتر گیا۔ اس وقت سورج عین سر پر تھا۔ قریب پہاڑ کی وادی تھی اور لوگ اتار چڑھاؤ پر چکر دگلتے ہوئے پگڈنڈیوں پر آ جا رہے تھے۔ مرد رنگ برنگ کی تہبندیں باندھے اور عورتیں نہائت چم چم کرتی سارنگ پہنے، بچوں کو اپنی پیٹھ پر بٹھلائے اپنے کام میں مصروف تھیں ان کے ہنس

ٹمکھ ننھے ننھے بچے دور سے یوں معلوم ہوتے جیسے چھوٹے چھوٹے گوتم کی خوبصورت مورتیاں پلیٹھ پر بیٹھی ہیں ۔ دو پہاڑوں کی ڈھلانوں اور خوبصورت وادی میں رہنے والے یہ گوتم کتنے خوش خوش زندگی بسر کرتے ہیں !"

میں نے دل میں کہا اور میرا خیال رانگامتی سے آگے پہاڑوں کی دشوار گزار پگڈنڈیوں کی جانب پھر گیا ۔ جہاں کرنافلی کی آب راہ میں ایک دخانی جہاز پر بیٹھ کر گیا تھا ۔ اس علاقہ میں جانے کے لئے یہی ایک راستہ ہے دریا سے اترتے ہی رانگامتی کے پُر اسرار پہاڑی راہ گزاروں میں نوجوان چرواہے اور لڑکے بالے اپنے مویشیوں کو چراتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ اس مقام کا نظم و نسق بڑا پرانا ہے ۔ بستی میں سرکاری اور اہم اعلانات نوٹس یا نشریات کے بجلئے اعلانچی کے ذریعہ عوام تک پہنچائے جاتے ہیں اور یہ اعلانچی باآواز بلند بنگالی اُردو میں ضروری سرکاری اعلانات سناتا ہے اور اس کی آواز سنتے ہی ہر راہ چلنے والا کھڑا ہو جاتا ہے ۔

رانگامتی باب الرہگذار ہے جہاں سے کوئی ایک گھنٹہ کا سفر کرنے کے بعد اونچی پہاڑیوں میں پہنچ جاتے ہیں ۔ ان دشوار گزار پگڈنڈیوں اور پہاڑ کے گھنے جنگلات میں مشرقی پاکستان کا سب سے بڑا قبیلہ چکما آباد ہے ۔ ان کا سربراہ راجہ ہے ان شاہی خاندان کے افراد اور عام چکماؤں میں بڑا فرق نظر آتا ہے عام طور

پر ان کے بچے برہنہ رہتے ہیں اور ان کے بھورے ننگے جسم کو سورج کی لہریں چوما کرتی ہیں۔ عورتیں صرف سارنگ پہنتی ہیں اور بڑی مضبوط اور محنتی ہوتی ہیں سر پر بوجھ اٹھائے پتھر کی مورتیوں کی طرح متحرک نظر آتی ہیں۔ مرد صرف تہبند اور دھوتی باندھتے ہیں ان لوگوں کی بود و باش صدہا سال قدیم ہے اور ان پر جدید ترقی کا کوئی اثر اب تک نہیں ہوا ہے۔ ان لوگوں کی خودداری اور سادگی کی مثال شاید کہیں اور دیکھنے میں نہیں آسکتی۔ اگر ان کے بچوں کو کوئی چیز تحفتہً بھی دی جائے تب بھی وہ اپنے پاس رکھنے کے بجائے فوراً آپ کو واپس کر دیں گے۔ جیسے ان چیزوں کی انہیں ضرورت ہی نہیں اور انہیں یہ بھی خبر نہیں کہ تحفہ ہوتا کیا ہے اور حقیقت میں انہیں دنیا کی کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ان کی ضروریاتِ زندگی بہت کم ہیں اور رہائش کے لئے کچے مکانوں اور بانسوں کے جھونپڑوں میں رہنا پسند کرتے ہیں یہ جھونپڑے اور مٹی کے گھر پہاڑ کی اونچی اونچی چوٹیوں اور درختوں سے گھری ہوئی چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہیں جہاں تمام دن لوگ اپنے مویشی، بھیڑیں، بکریاں اور کھیتی کسانی دکھیتی کسانی کا طریقہ بڑا قدیم ہے جسے "جھُوم" کہتے ہیں۔ جنوری فروری میں جنگل صاف کیا جاتا ہے اور مارچ و اپریل میں یہ کٹا ہوا جنگل نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے۔ پھر ملبا صاف کیا جاتا ہے اور ہل چلانے

کے بجائے کسان، چاول، مکئی، روئی اور دوسری ترکاریوں کے بیج ملاکر داؤ سے زمین کھود کر سوراخ میں ایک مٹھی بیج ڈالتا چلا جاتا ہے اور ہر فصل اپنے اپنے موسم پر تیار ہوتی جاتی ہے۔ اور اس کی کٹائی ہوتی رہتی ہے۔ اسی طریقے سے ماگھ بھی کاشت کرتے ہیں۔) میں مصروف نظر آتے ہیں ان پہاڑوں کی راہ گزاروں میں رہنے والے چکما کی بستی کا نظارہ طلوع اور غروب آفتاب کے وقت ان کے چھوٹے مندروں کی کلس چاندی کی مانند جھلمل جھلمل کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ کتنا دلفریب منظر ہوتا ہے۔ اس کی منظر کشی تو کوئی شاعر فطرت ہی کر سکتا ہے۔

ابتدا میں چکما بھی اراکان ہی سے آگے چٹاگام کے جنوب میں آباد ہو گئے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ پہاڑوں کی راہگزاروں اور بلندیوں میں پھیل گئے ان کے منگولی اور برمی خدوخال بڑے جاذب نظر ہوتے ہیں۔ جب چٹاگام اور اس کے گرد و نواح میں آبسے تو مقامی لوگوں کے میل جول سے بنگالی بولنے لگے عہد مغلیہ میں مغل سپاہیوں نے چکما عورتوں سے شادیاں کیں اور اس باہمی اختلاط نے ان کی طرز معاشرت اور خیالات پر بھی بڑا گہرا اثر چھوڑا یہاں کے سترہویں صدی عیسوی کے حکمران کا نام مسلمان جیسا تھا اور شیر دولت کے نام سے مشہور تھا لیکن رفتہ رفتہ اس قبیلے کا اعتقاد پھر ہندو مت کی طرف ہو گیا۔ "رانی کالندی" نے جب ہندو مت اختیار کیا۔ اس وقت ایک بڑا انقلاب رونما ہوا۔ جس کی تاریخی کہانی طلسم ہوش ربا سے کم نہیں۔ قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں چمپا نگر کا راجہ جو

سورج دیوتا کی اولاد سے تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے ایک کا نام بجوئے گری اور دوسرے کا نام ساماگری تھا۔ نئی دنیا کی تلاش اور فتوحات کے شوق میں بجوئے گری نے مشرق کا رخ کیا اور اس نے دریائے میگھنا عبور کر کے اراکان فتح کر لیا اور وہیں متقیم ہو گیا۔ اراکانی بادشاہ سے اس کے تعلقات بہت اچھے ہو گئے اور اس کے سپاہیوں نے ارکانی عورتوں سے شادیاں کر لیں اور وہ بھی وہیں آباد ہو گئے۔ لیکن بجوئے گری کچھ عرصے کے بعد دریائے ناف کی ترائی میں آبسا۔ اور اس کی فوج کی کثیر سپاہ نے رہتے سہتے بدھ مت اختیار کیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد یہ لوگ بھی دریائے ماتا موہری کے کنارے آکر آباد ہو گئے۔ جہاں آج بھی ان کی قدیم بستی کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ اسی خاندان کا سب سے مشہور بادشاہ شیر دولت تھا جو کرامات اور جادوگری میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ لیکن وہ جو کچھ کرتا اس کا راز اپنی بیوی سے کبھی نہ بتاتا تھا۔ لیکن ایک روز اس کی بیوی کو اس کی کرامات کا راز مل گیا۔ اور اس نے بھی وہی جادوگری کے کرتب دکھلائے تو شیر دولت نے اسے قتل کروا دیا اور اس کے بعد اس نے اس کے خاندان کے تمام افراد کو بھی مروا ڈالا اور جب اس کے ظلم کی انتہا ہو گئی تو اس کی رعایا نے اسے قتل کر دیا۔ مگر انہیں شیر دولت کے خیر خواہوں سے جب خطرہ معلوم ہوا تو وہ شمال کی طرف نکل آئے اور رنگو نیہ میں بس گئے اور پھر اس مقام سے آگے رفتہ رفتہ مشرق اور شمال میں آکر آباد ہو گئے اور اس طرح مشرقی پاکستان کا یہ پہاڑی قبیلہ اپنے پیچھے ماضی کی تاریخ کے قدیم

دور سے گزر کے آج اپنی زندگی کے ماہ و سال بڑی آزادی کے ساتھ گزار رہا ہے۔ ان لوگوں کی صفائی پسند طبیعت اور سیدھی سادی زندگی کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ قدرت کے حسین نظاروں میں رہتے سہتے ان کے عادات و اطوار بھی بڑے اچھے ہیں۔ ان کی زندگی وحشیوں جیسی نہیں بلکہ وہ لوگ بڑے ہنس مکھ اور ملنسار ہیں اور تمام دن محنت مزدوری کر کے شام کے دلکش لمحات گاتے بجاتے، رقص کرتے ہنسی خوشی گزار دیتے ہیں۔ اگر مذہبی اعتبار سے وہ بدھ مت، ہندو مت اور (ANIMONIA) کے ملے جلے طرزِ زندگی کے عادی اور قانون کے ماننے والے ہیں۔ لیکن وہ بڑے سچے، ایماندار، محنتی اور قانون کے پابند بھی ہیں۔

جس طرح ہماری تھکی ماندی بادبانی کشتی کنارے سے بندھی آرام کر رہی تھی۔ میں بھی خیالات کی وادیوں میں کھویا ہوا بادبانوں کی رسی پکڑے ہوئے اس طرح بیٹھا ہوا آرام کر رہا تھا۔ جیسے قدرت کے حسین ڈوروں سے بندھا ہوا ہوں کہ اتنے میں جہاویرو آگیا اور اس نے آتے ہی مسکرا کر کہا:۔

"لیجیے، بھوجن کر لیجیے۔ پھر ہم دونوں تھوڑی دیر آرام کریں گے اور دوپہر کے بعد واپس لوٹ چلیں گے۔"

میں نے کہا۔ "واپسی سے پہلے مجھے گیت نہیں سناؤ گے؟"

جہاویرو مسکرا دیا۔ اور پھر اس نے بڑی پُرخلوص نگاہوں سے دیکھا اور پھر ہم دونوں بڑی خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف

ہو گئے۔ اور جلد ہی ہی فارغ ہو کر آمنے سامنے لیٹ رہے۔ مجھے کھانا
کھانے سے جیسے گرانی سی معلوم ہونے لگی۔ مگر میں آنکھ بند کئے لیٹا رہا
میرے ذہن اور نگاہوں میں اس علاقے کی ساری شادابیاں بسی ہوئی
تھیں اور لطیف ہوا کے نازک جھونکے نظر سے پوشیدہ مسطح صفحۂ آب
پر رقص کر رہے تھے جس کی وجہ سے ہلکی ہلکی غنودگی مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔

سئی ندی کے کنارے

(جہاں میرا بچپن سو رہا ہے)

شام کے وقت ہلکی سی بارش ہوئی تھی اور زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک بڑا لطف دے رہی تھی۔ سہانی گھڑی نے میرے ماضی کے خوشگوار لمحوں کو میرے ذہن کے پردے پر یوں پیش کرنا شروع کر دیا جیسے کوئی فلم دکھایا جا رہا ہو۔ اور مجھے بیٹھے بیٹھے اپنے آبائی وطن کے مناظر یاد آ گئے۔

رائے بریلی شہر کے پرانے کھنڈرات، لق ودق مکانات، تنگ پختہ اور پر پیچ گلیاں پتھریلی ویران سڑکیں اور قلعہ کے شکستہ در و دیوار بڑا سا محرابی دروازہ جس کے ایک چبوترے پر ٹنڈا چنو چراغ روشن

کئے بھٹیا چلا رہا تھا۔ "کباب چٹ پٹے!"

اور ان چٹ پٹے کبابوں کا نام سنتے ہی میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ شام ہی سے قلعہ کے بازار میں اچھی خاصی چہل پہل ہو جاتی دیئے اور لالٹینیں ٹمٹمانے لگتیں اور لوہے چڑھے پہیوں والے یکے کی گڑگڑاہٹ سن کر فوراً خیال آجاتا کہ کوئی مسافر اسٹیشن سے چلا آرہا ہے اور ٹنڈا یکے کی آواز سن کر زور سے صدا لگاتا اور دو چار دس کا مجمع چٹ پٹے کبابو پر چیل کی طرح جھپٹ پڑتا۔

ٹنڈا چنو یوں بھی بڑا باتونی اور چرب زبان تھا اور اپنے گاہکوں کو اپنی لگاتار لن ترانی سے اور زیادہ متوجہ کر لیتا تھا اور بڑے مزے لے لیکر گنگنانے لگتا۔ "آیئے بابوجی — گولا کباب ہیں۔ جن میں پڑے بارہ مسالے — دو کی قیمت دو دو پیسے — وزن میں ہیں کسوری جیسے —" اور پھر ایک لمبی تان کر پکارتا "آیئے — کباب چٹ پٹے! ایک بار کھایئے — سدا گن گایئے۔!!"

چنو کی آواز میرے کانوں کے دریچوں سے پھر ٹکرائی اور میں بڑے کنویں کی طرف مڑ گیا۔ میں نے دیکھا بڑا کنواں ویران پڑا تھا۔ اندر جھانک کر دیکھا تو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر ہاتھ ہاتھ بھر لمبی گھاس اُگ آئی تھی۔ بوسیدہ دیوار کے محراب میں ایک محترم اُلّو صاحب براجمان تھے جنھیں دیکھنے سے ایسا لگا جیسے کوئی سادھو مدت سے دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ تپسیا کرتے کرتے اُلّوؤں کے سادھو جی

شاید عالم بالا میں محو پرواز تھے کہ اتنے میں کنویں کے ایک شکستہ گول سوراخ سے حضرت ناگ صاحب نے اپنی کھوپڑی باہر نکال کر انہیں غور سے دیکھا اور آہستہ آہستہ رینگتے لگتے۔ میں نے سوچا اب جناب محترم سادھو جی کی شامت آچکی ہے چنانچہ میں نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر محراب کے سوراخ کو نشانہ بنا کے پھینکا تاکہ ناگ صاحب سادھو کی تپسیا میں خلل نہ پیدا کریں۔ میرا پتھر پھینکنا تھا کہ الو بڑی آواز سے چیخ کر کنویں کے اندر گولائی میں اڑنے لگا اور تین چار چکر لگاتا ہوا کنویں سے باہر فضاؤں میں گم ہو گیا۔ اور میں بڑے کنویں سے حضرت شیش ناگ کو شکست دے کر سیدھا گلاب سنگھ مہاراج کی کوٹھی کی طرف نکل آیا جس کے مقابل ہی "جگیاں تال" کا بلند بالا ٹیلہ تھا جس کے تین طرف کمر کمر پانی تھا کہیں کہیں سرپت کی گھنی جھاڑیوں سے پانی کا پتہ بھی نہ چلتا تھا۔ ٹیلے کے نیچے سے لے کر انتہائی بلندی تک گھنے درختوں کے گہرے سائے میں بابا ڈارون کے اجداد حکمراں تھے۔

خونخوار بندر اور لنگوروں کی ٹولیاں ہر دم شور مچاتی، درخت درخت اچکتی پھاندتی رہتیں۔ عورتوں سے جیسے انہیں خاصی دشمنی تھی یا پیار ہوگا۔ جہاں انھوں نے کسی عورت کو ٹیلے کے قریب سے گزرتے دیکھا اور بس راہزنوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ ایک دفعہ تو ستیل چمار کی جوان بیٹی پر تو انھوں نے ایسا حملہ کیا کہ اس بیچاری کے ساڑھی کے سارے بل کھول ڈالے تھے اگر لوگ وقت پر اس کی مدد کے لئے

نہ پہنچتے تو شاید وہ اسے اٹھا بھی لے جاتے۔

میں ابھی اس جزیرے میں ہی گھوم رہا تھا کہ میرے ذہن کے ٹیلیویژن پر ریتی رام کا تالاب اُجاگر ہو گیا۔ ناگ پنچمی اور تیج کے میلوں کی بہاریں، پوربی دوشیزاؤں کے تڑپا دینے والے دیہاتی گیتوں سے ذہن کا ریڈیو بجنے لگا۔ رات ہی سے ہندو مرد عورتیں، بچے، بوڑھے جوان، بیل گاڑیوں اور رتھوں میں سوار کجری اور ملہار کی تانیں لگاتے ڈھول بنسریاں اور گھنگھرو بجاتے آنا شروع ہو جاتے تھے اور صبح ہونے تک میلے میں ہزاروں آدمی جمع ہو جاتے، ہاٹ بازار سج جاتے، مٹی اور مٹھائی کے کھلونوں کی دکانوں پر بچوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ اور یہیں محبت کے پروانوں اور عشق کی دیویوں کی ملاقاتیں ہوتیں۔ پیار کی پینگیں بڑھتیں اور جھولوں پر بیٹھی ہوئی کنواریاں ہلکی ہلکی پھوار سے جیسے مست ہو جاتیں اور جھولے کی لمبی لمبی پینگوں کے ساتھ ہی درد بھرے گیت چھیڑ دیتیں۔

سانولیا کاہے مارے نجریا۔۔۔

جیسے دودھ میں پانی ملت ہے\
ویسے ملوں میں تورے ساتھ\
جیسے اکاس میں چڑیا اڑت ہے\
ویسے اڑوں میں تورے ساتھ\
کاہے مارے نجریا سانولیا۔۔۔

میرے ذہن کا ریڈیو بجتے بجتے ایکا ایکی خاموش ہو گیا اور میں

عیدگاہ سے ہوتا ہوا۔ شیرانا ڈی کے مقام پر نکل آیا۔ ایک تباہ شدہ شہر کا ٹیلہ جس کے پُر اسرار محلات اور خزانوں کے قصّے سینہ بہ سینہ گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو خوب یاد تھے اللہ بخشے دادی جان اکثر سنایا کرتی تھیں کہ شیرانا ڈی پر مردوں کی حکومت ہے اور آدھی رات کے بعد روحیں گھوڑوں پر سوار مشعلیں ہاتھ میں پکڑے ٹیلہ کا طواف کرتی ہیں۔ کہانی تو بڑی دلچسپ تھی مگر اب تو یاد بھی نہ رہی۔ ہیں ۔۔۔ انہیں ویرانوں اور پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا ہرے بھرے کھیتوں کی طرف نکل آیا سامنے ہی میرا گاؤں تکیہ تھا سئی ندی کے ایک بلند کنارے پر، جہاں ہمارے اجداد کے چند گنے چُنے گھر تھے۔ اس گاؤں سے شہر رائے بریلی کوئی ڈیڑھ دو میل دور ہوگا مگر اسے بھی سئی ندی کی قربت حاصل تھی برسات کے زمانے میں تو ندی میں جب طغیانی آتی تو پانی شہر کی حدود میں بھی داخل ہو جاتا تھا۔ گویا شہر رائے بریلی اور تکیہ دونوں ندی کے مدوجزر سے خوب واقف تھے اور سئی ندی کو ان دونوں کی تاریخ بھی خوب یاد تھی (مجاہد اعظم حضرت سیّد احمد شہید رح (رائے بریلوی) اسی تکیہ کے متبرک خاک سے اٹھے تھے اور سرحد کے کوہستانوں میں جا کر اسلامی جمہوریت اور آزادی کے لئے جہاد کیا تھا۔)

سئی ندی کے بلند کنارے پر پرانا گھر ایک قلعہ کی حیثیت رکھتا تھا اس کے گول محرابی بیرونی دروازے سے نکلتے ہی سیدھے ہاتھ پر گڑھیا تھی جس کے چاروں طرف بانس کے پیڑ کھڑے تھے اور سامنے ناک کی سیدھ

بغیر گنبد اور میناروں کے مسجد تھی۔ الٹے ہاتھ پر سپاٹ مربع چبوترہ تھا جہاں ایک لمبا کمرہ بنا ہوا تھا جسے بنگلہ کہتے تھے چاندنی راتوں میں گاؤں کے تقریباً سارے بزرگ بعد نماز عشا اکثر یہاں بیٹھ کر دنیا بھر کے قصے سنایا کرتے تھے۔ بنگلے کی پشت پر کھنڈر میں ہمارے کسی بزرگ کی قبر تھی اور اس کے ساتھ ہی مسجد کا چبوترہ تھا۔ گھٹنے گھٹنے اونچا اور بیچ میں مسجد جس کے قریب مغرب میں قبرستان اور جنوبی چبوترے سے آٹھ دس گز نیچے سئی ندی تھی۔ قلمی آم اور کھٹ میٹھے آموں کے درختوں پر جب ہرے ہرے پیلے پھل جھومر کی مانند لٹکنے لگتے تو سینکڑوں ہرے ہرے طوطوں کی چہکوں سے باغ گونج اٹھتا تھا۔ یہ تھا تکیہ کا محل وقوع جس کے خوشگوار اور پر سکون ماحول میں رہنے والے آٹھ دس گھر کے چالیس پچاس انسان جیسے باقی دنیا سے بالکل بے خبر تھے اور بڑے چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ چھوٹے موٹے کام کاج، کھیتی باڑی، خوش گپیوں اور شکار میں اپنے ماہ و سال گزار دیتے تھے۔

برسات کے موسم میں جب سئی ندی میں غضبناک طغیانی آتی تو مسجد سے لے کر پورے گاؤں کے حدود اربع میں پانی ہی پانی پھیل جاتا تھا اور دور سے تکیہ ایسا لگتا تھا جیسے سمندر میں کوئی چھوٹا سا ٹاپو واقع ہے مسجد کی پشت پر جہاں سے سیڑھیاں ندی کنارے جانے کے لئے بنی ہوئی تھیں ایک مولسری کا بڑا پرانا اور گھنا درخت کھڑا تھا مستطیل نما پتھر کی سلوں کی سیڑھیاں اترتے ہی ندی سے ملا ہوا

چھوٹا سا گھاٹ تھا جہاں نمازی بیٹھ کر وضو کرتے تھے اور لوگ نہایا دھویا کرتے تھے۔ اس گھاٹ سے پاس ہی ایک ڈونگا بندھا رہتا تھا جس سے دیہات کے لوگ اس پار سے اُس پار آتے جاتے تھے اور ہر آنے جانے والا گرمیوں کی دوپہروں میں مولسری کے گھنے سایہ تلے کچھ دیر سستانے کے لئے ٹھہر جاتا۔

مولسری کا درخت کسی زمانے میں میری طرح جوان ہوگا اور اس کے جذبات بھی کسی کسان دوشیزہ کے میٹھے سپنوں سے زیادہ دلکش ہوں گے اس وقت اس کی ٹھنڈی چھاؤں اتنی گہری نہ ہوگی مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ میں نے اس کو بڑھاپے کے دور سے ہی گزرتے دیکھا تھا اور جب میں جوان ہوا تو اس وقت بھی اس کی ہیئت ویسی ہی تھی جیسے میرے بچپن میں مجھے نظر آتی تھی۔ اسی درخت کے سائے میں حافظ سید بیٹھے ہوئے تکیہ کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے اُردو املا لکھایا کرتے۔ سامنے چکرورتی کی حساب کی موٹی سی کتاب کھلی رہتی اور حافظ جی جمع، ضرب، تقسیم کے سوالات حل کرایا کرتے۔ ان کی کرخت آواز اور ہری کی موٹی سی چھڑی جیسے ایک ساتھ ہی حرکت کرتی تھی اور سارے بچّے سہمے ہوئے بڑی توجہ سے اپنا اپنا سبق رٹا کرتے اور جب چھٹی ملتی تو ندی کے کنارے حامد ڈ اکو کا کھیل شروع ہو جاتا۔ تیراکی کا مقابلہ ہوتا۔ کُشتی اور کبڈّی ہوا کرتی اور کبھی آم کے باغوں میں کچّی کچّی امبیوں پر یلغار کرنے نکل جاتے اور کبھی دریا کے کنارے چھوٹے چھوٹے گھروندے بناتے ہوئے اور کھیروں کے کھیتوں کو تہہ و بالا کرنے میں مصروف

نظر آتے ۔ مولسری کا درخت اور سئی ندی بھی جیسے ہمارے کھیلوں میں مشفق بزرگوں کی طرح شریک تھے مگر حافظ جی کی ارہر کی چھڑی جب دور سے دیکھ لیتے تو ساری شرارتیں بھول جاتے ۔

مولسری کے درخت نے اور سئی ندی کی خاموش روانی نے نجانے کتنی بار ہزاروں، پرندوں، جانوروں کی بولیاں، راہ چلنے والوں کی گفتگو اور راز و نیاز کی باتیں سنی ہوں گی مگر درخت خاموش رہتا تھا اور ندی پُر سکون بہتی رہتی تھی۔ ان دونوں کو دیہاتی زندگی کے سارے قصّے یاد ہونگے ۔ جاڑوں، گرمیوں، برساتوں کی کہانیاں، زمینداروں اور کسانوں کی کشمکش، اَن گنت جھگڑے اپنے سینے میں چھپائے رکھتے ہوں گے۔ اور پھر لُنیا پاٹے دھوبی گھاٹ پر، مہوے کے درختوں کی آڑ میں ستیل چمار کی بیٹی کے عشق کا قصّہ بھی حرف بحرف یاد ہوگا جب وہ اور گڑ دین کا پوتا چوری چھپے ڈونگے پر سوار ہو کر چاندنی راتوں میں ندی کے بیچ دبیچ راج گھاٹ کے پُل سے بھی دُور بہتے چلے جاتے تھے اور پھر شاید اسی مولسری کے درخت کے نیچے بیٹھ کر دنیا کی نگاہوں سے اوجھل اپنے دلوں کی دھڑکنوں کو محسوس کرتے ہوں گے — اور انھیں وہ اندھیری راتیں بھی یاد ہوں گی جب چور اس مولسری کے درخت کی آڑ میں بیٹھے ہوئے چوری کے منصوبے تیار کرتے ہوں گے اور جہاں گرمیوں کے دنوں میں چرواہے اس درخت کی کانپتی ہوئی پتیوں کی ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھاتے ہوں گے اس کے علاوہ برسات کے دنوں میں " رکسا کُنڈ " پر مچھلی کا شکار کھیلنے کے لئے صدیق میاں، اسمٰعیل میاں یعقوب اور سلامت اور ان کے

ساتھی جب گزرتے تھے تو اسی مولسری کے درخت کے نیچے بیٹھ کر کیچوے زمین سے نکالتے تھے اور ایک دوسرے سے اپنے شکار کی حکائتیں بیان کرتے تھے بس یہی ایسی زندہ جاوید کہانیاں تھیں جن میں سچائی اور فطرت کے بہت سے رموز پوشیدہ تھے۔ مجھے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی شرارتیں۔ حسن بھائی، کا مولسری کے درخت کی ڈال پر لٹک کر موٹر سائیکل چلانا، بتول، خالد، قاسم، ننھے، حسین، اطہر، طاہر اور دوسرے بچوں کا خوش ہو کر تالیاں بجانا جب یاد آجاتا ہے تو وہ بوڑھا مولسری کا درخت اور صدیوں سے بہتی ہوئی سئی ندی بھی ایکا ایکی یاد آجاتی ہے۔ مجھے ان دونوں سے ایک طرح کا عشق تھا اور ان کی بڑی تعظیم کرتا تھا بعض اوقات جب آسمان پر بادل چھلے رہتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے مولسری کا درخت گہری گہری سانس لے رہا ہے اور گاؤں کی بسیط فضاؤں سے نگاہیں پھیرے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے اس کی شفقت سے بھرپور نگاہوں میں ایک ابدی سچائی اور مسرت محسوس ہوتی تھی ایسی سچائی اور مسرت جو تھکے ماندے مزدوروں اور کسانوں کو ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر صدیوں سے محسوس ہوتی چلی آرہی ہے۔!!

ختم شد